چوتھا باب

آخری پیشی

کچھ گھنٹے قبل، ایف آئی اے آفس کے باہر:

صبح وہ یہاں آئے تھے، اور اب دوپہر ہو چکی تھی۔ سورج سروں پر چڑھ آیا تھا۔ جنوری کا مہینہ ہونے کے باعث دھوپ میں بھی ہلکی ہلکی ٹھنڈک تھی۔ وہ چاروں اُس چبوترے جیسے بنے فوٹ پاتھ پر ایک دوسرے سے دور کھڑے تھے۔ اُنکے علاوہ وہاں کوئی نہ تھا۔ شیراز اُنہیں انتظار کرنے کا کہہ کر گیا تھا۔ یہاں سے مختلف گاڑیوں میں اُنہیں واپس جانا تھا۔ جسکے بعد وہ سب الگ الگ مقامات پر موجود اپنی ذاتی گاڑیاں حاصل کر کے اپنی اپنی منزلوں پر جا سکتے تھے۔

اس وقت وہ چاروں ایک ساتھ ایک ہی جگہ کھڑے تھے، بلکل ایسے ہی جیسے آج صبح اُس گول کمرے میں بیٹھے تھے۔ اور اب بھی موت جیسا سنّاٹا اُنکے بیچ چھایا ہوا تھا۔

مقدّم حیران تھا، اُنکے آپسی رویوں پر۔ وہ جب یہاں سے گیا تھا، تب سب دوست تھے۔ اسے لگا تھا آج بھی وہ دوست ہی ہوں گے، لیکن اُنکے رویے کوئی اور ہی داستان سنا رہے تھے۔ کالے تھری پیس سوٹ میں ملبوس علی کا چہرہ سخت اور اعصاب تنے ہوئے تھے، نِگاہیں سامنے درختوں کے جھنڈ پر مرکوز تھیں۔

بلیک جینز پر سفید شرٹ پہنے اور اُس پر کائی رنگ کا کیجوال کوٹ ڈالے رضا، سب سے دور ایک پول سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ چہرہ سپاٹ اور نِگاہیں اپنے سفید جوگرز پر مرکوز کیے، وہ بیزار لگتا تھا۔

رضا سے ہوتی مقدّم کی نظریں عمر پر آ ٹھہریں تھیں۔ غم زدہ، اُداس سا چہرہ خاموش تھا۔ نِگاہیں گم صم سی کسی غیر مرئی نکتے پر مرکوز تھیں۔ اُسکا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر اُس سے بات کرے، جب وہ غائب ہوا ہو گا، تو یقیناً اُس نے اُسے ڈھونڈا ہو گا، اور آج اُسے سامنے دیکھ کر، اُسے بھی مقدّم سے ڈھیروں شکوے ہوں گے۔ مقدّم اُس کے سارے شکوے سننا چاہتا تھا، اُسکی ناراضگی بجا تھی لیکن فلوقت اُنکے چہرے، اُسکی ہمت ختم کرنے کے لیے کافی تھے۔ وہ خاموشی سے اُنکی حرکات و سکنات نوٹ کرتا رہا، پر کوئی بھی اندازہ لگانے سے وہ قاصر ہی رہا۔

تھوڑی دیر میں وہاں بیک وقت کالے شیشوں والی چار گاڑیاں آئیں تھیں۔ ساتھ میں شیراز بھی تھا۔ ایک تو وہ جاتا کہاں سے تھا اور آتا کہاں سے؟ سمجھ سے باہر تھا۔

شیراز نے انکو باری باری اُنکی گاڑیوں کی جانب بھیجا۔ بیٹھنے میں پہل رضا نے کی تھی، جیسے وہ بس یہاں سے نکلنے کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اُسکے بعد علی بھی اپنی بتائی گئی گاڑی میں جا بیٹھا۔ آخر میں عمر اپنی گاڑی کا دروازہ کھولے بیٹھنے ہی لگا تھا کہ اُسکی نظریں مقدّم پر گئی۔ وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا، آنکھوں میں ڈھیروں سوالات تھے، شکوے تھے، حکایات تھیں۔ اُسکی بہت کچھ کہتی آنکھوں نے عمر کو منجمد کر دیا۔ اگلے ہی لمحے مقدم نظریں پھیرے گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ عمر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

''آغا۔۔۔"اُس نے زیرِ لب دہرایا تھا۔

''سر! چلنا نہیں ہے؟"ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے اُسکی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی تھی۔ وہ گہری سانس لیتا گاڑی میں بیٹھ گیا۔

قسمت نے کس موڑ پر لا کر ملایا تھا؟ اور ملایا بھی تھا تو کیسے؟ اُن میں سے ہر ایک کو اُسکے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

جو کچھ ہو رہا تھا، اُس پر اب عمر نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اُسکا ذہن فلوقت کسی بھی نہج پر سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

رہ رہ کر سب کے چہرے یاد آ رہے تھے۔ علی کے ساتھ وہ پچھلے دو سالوں سے تھا لیکن کسی اجنبی کی طرح، مقدّم کی سوال کرتی آنکھیں، رضا کی مغرورانہ شخصیت اور نوید۔۔۔

نوید نے تو اُسے حیران ہی کر دیا تھا۔ کس قدر تبدیلی آگئی تھی اُسکی ذات میں۔ آنکھیں موند کر اُس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔

''اُمید ہے حسین مرتضیٰ بھی ہمارے ساتھ ہوگا''ڈی آئی جی فرّخ کی آواز کانوں میں گونجی تو آنکھیں دوبارہ وا کرتے اُس نے کھڑکی سے باہر دوڑتے درختوں کو دیکھا۔

حسین کو تو وہ بھول ہی گیا تھا۔ وہ جانے کہاں تھا؟ کس حال میں تھا؟ کیسا تھا؟ اور قسمت نے دوبارہ اُس سے ملنا لکھا بھی تھا یا نہیں؟ مختلف سوچیں دماغ میں گھر کر رہی تھیں۔ وہ اُن سے جان نہیں چھڑا پا رہا تھا۔ تھک کر اُس نے دوبارہ آنکھیں بند کیں اور سیٹ سے سر ٹکا دیا۔

--------+-------+------

''آپ بچوں کو وقت پر سلاد دیجیے گا، میں پناہ گاہ نہیں آسکوں گا ابھی، شاید دیر رات سے آؤں'' اپنے اپارٹمنٹ کے ٹیرس پر کھڑے، وہ فون کان سے لگائے کسی کو ہدایت دے رہا تھا۔ دوسری طرف سے کچھ پوچھا گیا۔

''نہیں نہیں ! میں ٹھیک ہوں۔ بس کچھ کام ہیں'' اُس نے تسلّی دینے والے انداز میں کہا اور تھوڑی دیر بعد فون بند کر کے پاس رکھی ٹیبل پر رکھ دیا۔ ایک ہاتھ میں جلتا سگریٹ لیے، دونوں کہنیاں ریلنگ پر رکھے وہ آگے کو ذرا جھک کر ٹیرس میں کھڑا تھا، سامنے ہی ٹھاٹھیں مارتا سمندر واضح تھا۔ کون اُسے مارنا چاہتا تھا؟ کیوں؟ کس لیے؟ اور آخر تھا کون جو اُنکی دشمنی میں اتنا پاگل تھا کہ اُنکے لیے پورا مرڈر پلان کر رہا تھا اور وہ بھی دس سالوں سے؟ دماغ کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔

وہ خود کو جتنا لاتعلق ظاہر کر سکتا تھا، اُس نے کیا تھا۔ صبح سے وہ بے نیازی کا خول خود پر چڑھائے حالات کا سامنا کرتا رہا تھا۔ لیکن اب اُسکی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ تھک کر میز کے ساتھ رکھی سفید کرسی پر بیٹھ گیا۔ تقریباً ختم ہوتی سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر، سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔

ایک ایک چہرہ اُسکی آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔ اُن سب کو سامنے دیکھ کر وہ جتنی بے نیازی دکھا سکتا تھا اُس نے دکھادی تھی۔ عمر، مقدّم، نوید اور علی۔۔۔

''علی!!!'' اُس نے زیر لب دہرایا تھا۔ ایسا لگا تھا جیسے کسی نے اُسکا حلق تک کڑوا کر دیا ہو۔

''تم کتنے بڑے منافق ہو، میں بہت اچھے سے جانتا ہوں'' کرسی پر آگے کو ہو کر جھکے، دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے اور دونوں ہاتھوں کو باہم پھنسا کر، اپنے ہونٹوں کو اُس پر ٹکائے، رضا نے غائبانہ علی کو مخاطب کیا تھا۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

ٹیرس کے اس حصے کا تمام فرنیچر سفید تھا، جبکہ دیواریں اور فرنیچر پر رکھے تکیے اور فوم وغیرہ نیلے رنگ کے تھے۔ سفید ٹراؤزر پر، سفید زیپر ہائی نیک پہنے وہ بھی منظر کا ہی حصہ لگ رہا تھا۔ اُسکا ڈریسنگ سینس کمال کا تھا۔

''رضا؟ ہونہہ۔۔۔'' کسی کی استہزاء کرتی ہنسی اُسکے کانوں میں گونجی تو چہرہ سرخ ہوا۔

''رضا پہلے خود کو تو سنبھال لے، جو اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا وہ کسی اور کے لیے کیا کریگا؟'' دس سال پہلے کہے گئے، علی کے الفاظ، آج اُسکے کانوں میں زہر گھولنے لگے تھے۔ اُس نے اذیت سے آنکھیں میچی تھیں۔

''تمہارے ایک جملے نے میری پوری زندگی برباد کردی تھی علی! میں خود کو تباہی کے دہانے پر لے آیا تھا۔ صرف تمہاری وجہ سے۔'' علی کو سامنے دیکھ کر جو کچھ وہ نہ کہہ سکا تھا۔ وہ اب کہہ رہا تھا۔ زیادہ سوچنے سے کنپٹی میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھی۔ اُس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ماتھا مسلا اور تھک کر کرسی پر گرنے والے انداز میں پیچھے ہو گیا۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ سر کا درد بڑھتا ہوا کاندھوں اور کمر تک جا پہنچا تھا۔ آہستہ آہستہ اُسکے ہاتھ اور پاؤں بھی سن ہونے لگے۔ دھندلی ہوتی آنکھوں سے اُس نے دیکھا کہ کوئی ہیولا اُسکے ٹیرس کے دروازے پر کھڑا، اپنی انگارہ ہوتی آنکھوں سے اُسے ہی گھور رہا ہے۔ وہ چیخنا چاہتا تھا پر آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ہیولا آہستہ آہستہ اُسکی جانب بڑھ رہا تھا۔

''وہ قاتل۔۔۔'' کھلتی بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اُسکے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا۔ ہیولا اُسکے قریب ہو رہا تھا، وہ اُٹھ نہیں پا رہا تھا، ہل نہیں پا رہا تھا، حتیٰ کہ آنکھیں کھولنا بھی مشکل محال تھا۔ ہیولا اُسکے سر پر پہنچ گیا، اُسکی سرخ انگارہ آنکھیں رضا کو نظروں ہی نظروں میں نگلنا چاہتی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اُس ہیولے نے اُسکا گلا دبا دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔ آس پاس دیکھا پر وہاں کوئی نہ تھا۔۔۔

ٹیرس کے پردے سمندر کی جانب سے آتی ہواؤں سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ سارا فلیٹ سنسان تھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا، جسم میں عجیب سی کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوا دروازے تک آیا، لاک اپنی جگہ پر ہی تھا، اُس نے کنڈی بھی لگا دی، پھر واپس ٹیرس پر آیا اور کرسی پر گر گیا۔ سر کا درد نا قابل برداشت ہوا تو اُسی طرح کرسی پر گرے ہوئے، اپنے ٹراؤزر کی جیب میں سے ایک دوا نکال کر آنکھوں کے سامنے کی۔

Benzodiazepines

بڑی مشکل سے پانی کے ساتھ یہ دوائی پھانکی۔ ڈاکٹر نے اُسے کسی بھی ناگزیر صورتحال کے علاوہ یہ گولی کھانے سے سختی سے منع کیا تھا۔ وہ اس دوا کو ہمیشہ جیب میں لیے پھرتا، ایکسپائر ہو جاتی تو نئی خرید کر جیب میں رکھ لیتا لیکن کھاتا نہیں تھا، آٹھ سالوں میں آج دوسری بار یہ موقع آیا تھا، جب اُس نے یہ دوائی نکالی تھی۔ اُن لوگوں کا منظر عام پر آنا اُسے کس نہج پر لے آیا تھا؟

''مجھے اُن میں سے کسی کے سامنے نہیں آنا، اگلی بار میں کسی بریفنگ یا مشاورت میں شامل نہیں ہوں گا۔ کسی کو میری جان بچانی ہے تو مجھ تک خود آئیگا۔ مجھے خود بچائے گا، میں کسی سے نہیں ملوں گا۔ مرنا قسمت میں لکھا ہے تو اس قاتل کے ہاتھوں ہی مر جاؤں گا۔ لیکن ان کے سامنے دوبارہ آ کر خود کو اس طرح پل پل نہیں مار سکتا۔''اُسکے کندھوں کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہونے لگا تھا۔ سر کے درد میں کمی آئی تو وہ غنودگی میں جانے لگا۔ اسی عالم میں وہ خود سے جانے کون کون سے وعدے کر رہا تھا؟ ساتھ رکھا فون بج رہا تھا، لیکن اٹھانے کی ہمت اُسکے ہاتھوں میں نہ تھی۔

''میں کسی کے سامنے نہیں آؤں گا۔۔ کسی کے بھی۔۔''وہ بڑبڑا رہا تھا۔

''اُمید ہے، حسین مرتضیٰ بھی ہمارے ساتھ ہوگا''آنکھیں بند ہونے سے پہلے یہ آخری الفاظ تھے جو اُسکے کانوں میں گونجے تھے۔

--------+-------+------

دس سال پہلے

سانحہ سے چند گھنٹے قبل:

''کدھر رہ گیا ہے یہ؟ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا''مقدّم نے بے چینی سے ٹہلتے ہوئے کہا تھا۔

''آ جائیگا، صبر رکھو''اپنے کیمرے کے ساتھ مصروف عمر نے تسلی دی۔

''پچھلے آدھے گھنٹے سے وہی کر رہا ہوں''

''یار! بیچارے کے ہزار مسئلے ہیں۔ پہلے اپنے بھائی کے گھر آنے کا انتظار کرے گا، وہ آجائیں گے، تو اُنکی منت کر کے بائیک لے گا۔ پھر آئیگا۔,, علی نے اپنے جگری یار کی طرفداری کی۔

''اُسکے بھائی کراچی آئے ہوئے ہیں؟''عمر نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! بتا رہا تھا کل، کہ بھائی کے یونٹ میں چھٹیاں ہیں۔''

''تو تم میں سے کوئی پک کر لیتا نہ اُس''حسین نے کہا۔

''پوچھاتھامیں نے، لیکن اُس نے سختی سے منع کر دیا کہ خود آؤنگا۔اور اب تک آیا نہیں'' مقدّم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔وہ سب اِس وقت اپنی گریجویشن والی کلاس کے لڑکوں کی طرف سے رکھی گئی، باربی کیو پارٹی میں جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔اُنہیں مقدّم کے گھر سے ساتھ نکلنا تھا، لیکن نوید اب تک نہیں آیا تھا۔

''رضا بھی چلتا تو کتنا اچھا رہتا'' علی کو اچانک ہی رضا یاد آیا تھا۔وہ اُنکے ساتھ نہیں جا رہا تھا۔

''اُسکی طبیعت ٹھیک نہیں ہے دو تین روز سے'' حسین نے جواب دیا۔

''وہ آج کل کلاس میں بھی ہمیں نہیں ملتا'' مقدّم نے حسین کو جتایا تھا۔وہ تینوں ساتھ ہی ایم بی اے کر رہے تھے۔

''ہاں !اُس نے آج کل ہم سے ملنا جلنا کم کر دیا ہے۔مجھے بھی وجہ سمجھ نہیں آتی'' علی نے پاس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا، کافی دیر سے کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔اپنے کیمرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے عمر کے ہاتھ تھمے۔وہ لوگ مقدم کے گھر کے لان میں تھے۔اس سے پہلے کے عمر کوئی جواب دیتا، گارڈ نے دروازہ کھولا اور اُسی وقت پورچ میں ایک بائیک داخل ہوئی۔وہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگے تھے۔

ہرے اور سفید رنگ کی لشکارے مارتی بائیک کے ہم رنگ اپر اور ہیلمیٹ میں ملبوس نوید نے بائیک روک کر ہیلمیٹ اُتارا۔

''سوری !دیر ہو گئی مجھے'' ہیلمیٹ اپنے سامنے رکھتے ہوئے، بیٹھے بیٹھے ہی کہا۔

''کس کی چوری کر کے لائے ہو؟'' حسین کا سکتہ سب سے پہلے ٹوٹا تھا۔لہٰذا سب سے پہلے وہی اُسکے پاس آیا تھا۔

''اپنی طرح سمجھ رکھا ہے؟'' اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔اُسکا چہرہ بھی آج خوشی سے چمک رہا۔باقی سب بھی اب وہیں آنے لگے تھے۔

''یہ سی بی آر ہے نا؟'' علی نے بائیک کے ہینڈل کو تھامتے ہوئے کہا۔وہ سب اب اُسکی بائیک کا معائنہ کرنے میں مصروف تھے۔

''ہاں !وہی ہے'' وہ بائیک پر ہی بیٹھا رہا۔

''بھائی نے نئی بائیک لے لی تمہارے؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''اُوں ہوں۔۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔''یہ میری اپنی ذاتی بائیک ہے''

''سچ بتاؤ'' عمر کو یقین نہ آیا۔

''حد ہے بھئی! میں نے اپنے ڈھائی سال کی محنت سے کمائے گئے، حلال پیسوں سے خریدی ہے۔'' اب کہ وہ برامان گیا۔

''ڈھائی سال میں تم نے سی بی آر کے پیسے جمع کر لئے؟'' حسین کو پکا یقین تھا کہ اُسکی بائیک چوری شدہ ہے۔

''ظاہر ہے، سیکنڈ ہینڈ (استعمال شدہ) ہے، اصل قیمت سے کئی گنا کم میں ملی ہے''

''اگر یہ سیکنڈ ہینڈ ہے تو بہت اچھی حالت میں ہے۔'' عمر نے تعریف کی تھی۔

''ہاں! صرف آٹھ ہزار کلو میٹر ہی چلی ہوئی ہے۔'' اُس نے بتایا۔

''تو جو کمایا تھا اسی پر لگا دیا؟'' حسین نے پھر تفتیش کی۔

''نہیں نہیں! کچھ بچے بھی تھے۔ اُن سے یہ اپر اور ہیلمیٹ خریدا ہے'' اُس نے مزے سے کہا۔

''امّاں ابّا نے کچھ کہا نہیں تمہارے؟'' علی مشکوک ہوا۔

''تم لوگوں کی تفتیش ختم ہو گئی ہو تو مبارک باد ہی دے دو مجھے'' اُس نے چڑ کر کہا تھا۔ ویسے ہی گھر والوں سے، وہ اپنی ساری کمائی اس پر لگا دینے پر، اٹھتے بیٹھتے خود غرض ہونے کے طعنے سن رہا تھا۔

''مبارک ہو یار!'' عمر نے آگے بڑھ کر گلے لگایا۔

''اس پر دعوت تو بنتی ہے۔'' مقدّم اور حسین کی زندگیوں کا بس یہی مقصد تھا۔

''میں نے اپنے سارے پیسے اس پر خرچ کر دیئے ہیں، حتیٰ کہ پیٹرول ڈلوانے کے لیے بھی بھائی سے ادھار لیا ہے۔ لہٰذا یہ دعوت نامی شے سے مجھے دور رکھو''

''دفع کرواِن دونوں کو، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔'' علی نے یاد دلایا۔

''تم لوگ جاؤ، میں نوید کے ساتھ آؤنگا'' حسین نے سی بی آر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں! میں تو علی کو ساتھ لیکر جارہا ہوں؟'' وہ فوراً پیچھے ہو کر بیٹھا کہ کسی دوسرے کے بیٹھنے کی جگہ ہی نہ رہی۔

''کیوں علی تمہاری بیوی ہے؟'' حسین نے ہمیشہ کا سوال دہرایا۔

''تمہیں جو سمجھنا ہے سمجھتے رہو، میں تو علی کو ہی لیکر جاؤنگا۔'' اُس نے بے مروتی کی انتہا کی۔

''دیکھ یار اِسکو! ساری زندگی ہم نے اِسکو پک اینڈ ڈراپ دیا اور اس نے تو آنکھیں ہی پھیر لیں'' حسین نے مقدّم کو دیکھ کر دکھی لہجے میں کہا۔

''مجھے ساری زندگی علی نے پک اینڈ ڈراپ دی ہے'' اس نے تصیح کی۔

''ختم کرو اس فضول بحث کو ہمیں دیر ہو رہی ہے'' علی کو اب غصّہ ہی آگیا تھا۔

''میں واپسی پر یہیں آؤنگا، تاکہ اپنی بائیک یہاں سے لیتے ہوئے جاؤں۔'' نوید بلآخر سی بی آر سے اترتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟ تم اس پر نہیں جا رہے؟'' عمر نے حیرت سے پوچھا۔

''بتایا تو ہے کہ پیٹرول اتنا زیادہ نہیں ہے۔ میں علی کی گاڑی میں ہی جاؤنگا''

''ابھی تو کہہ رہے تھے کہ علی کو ساتھ لیکر جاؤنگا''

''وہ تو میں اسکو چھیڑ رہا تھا'' اُس نے حسین کے سر پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ حسین نے اُسکا وہی ہاتھ پکڑ کے پیچھے موڑ دیا تو وہ ہنسنے لگا۔

''تو پھر سی بی آر کس خوشی میں ساتھ لائے تھے؟'' مقدّم نے چڑ کے پوچھا۔

''تم لوگوں کو دکھانے'' اُس نے اپر اتارتے ہوئے دانت نکالے۔

''چلو جلدی کرو'' مقدّم کہتے ہوئے اپنی گاڑی کی جانب بڑھا۔ نوید اپنا اپر تہہ کر کے، ہیلمیٹ میں ٹھونس رہا تھا۔ حسین اُسے ناراضگی سے گھور رہا تھا۔ نوید اُسے آنکھ مارتا آگے بڑھ گیا۔

اُسکے گریجویشن کے بیچ نے ڈیپارٹمنٹ والوں سے اجازت لیکر، وہیں گارڈن میں بورن فائر رکھا تھا۔ اُسکے لیے اُنہیں یونیورسٹی جانا تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی آج کی رات اُنکی زندگی میں آنے والی بے شمار تاریک راتوں میں سے ایک ہونے والی تھی۔

--------+-------+------

سانحے سے کچھ منٹ قبل:

''ٹھیک ٹھاک قسم کی ظالم انتظامیہ ہے یہاں کی''رات کے تین بجے وہ لوگ ایک دوسرے کے آگے پیچھے چل رہے تھے۔ یہاں آکر اُنہیں معلوم ہوا کہ ڈیپارٹمنٹ میں آنے والوں کی پارکنگ کا انتظام ایڈمن بلاک میں تھا۔اُسکے علاوہ اُنہیں کہیں سواریاں کھڑی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ایڈمن بلاک سے چل کر، کے یو بی ایس تک جانا، اور پھر واپس آنا جان جھونکوں کا کام تھا۔ آتے وقت بھی حسین نے انتظامیہ کو ٹھیک ٹھاک کوسا تھا، اور اب ایڈمن بلاک کی طرف واپس جاتے ہوئے بھی وہ انتظامیہ کو کوس ہی رہا تھا۔

''مجھے اس حرکت کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آرہی ویسے، وہ ڈیپارٹمنٹ میں بھی پارکنگ رکھ سکتے تھے۔ بلکہ کے یو بی ایس کے سامنے تو ویسے بھی اچھا خاصا بڑا میدان ہے۔ وہاں بھی پارکنگ رکھی جا سکتی تھی۔''مقدّم بھی چڑا ہوا تھا۔

''اُس جگہ آئی بی اے والوں کا ہاسٹل ہے، ظاہر ہے حساس جگہ پر پارکنگ نہیں رکھی جا سکتی''نوید کے ساتھ آتے عمر نے کہا تھا۔

''ہم تو اپنی گاڑیوں میں بم رکھ کر لا رہے تھے نا''مقدّم نے منہ بنایا تھا۔

''پہلے نکل جاتے تو سب کے ساتھ آتے، اب اس اندھیرے میں اکیلے آنا پڑ رہا ہے''علی نے بیزاری سے کہا تھا۔ اُسکی کلاس کے سارے طلبہ تقریباً گھنٹہ سوا گھنٹہ پہلے ہی نکل چکے تھے، بس وہ لوگ میزبان لڑکوں کے ساتھ رک گئے تھے اُنکی مدد کے غرض سے، کیونکہ وہ پوری ذمے داری کے ساتھ سارا سامان سمیٹ کے ہی واپس جاتے، وجہ صبح ہونے والی کلاس تھی۔

''اسکو جو شوق ہے نا، ہر جگہ امداد کے لیے پہنچ جاتا ہے''حسین نے اندھیرے میں عمر کو گھورا۔

''یار! وہ دو اکیلے لڑکے سب کچھ کرتے، ہم دعوت میں تو شریک رہے لیکن جب سب کچھ صاف کرنے کی باری آئی تو بھاگ جاتے؟ کتنی غلط سی بات ہے''اُس نے وضاحت دی۔

''ہاں! اور وہ دولڑکے میز بان ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بائیک تو ڈیپارٹمنٹ لے آئے تھے، اور اُس پر چلے بھی گئے۔ اب ہم اکیلے آرہے ہیں۔'' علی کو رات کے اس وقت جامعہ سے خوف آرہا تھا۔ وہ درخت جو دن کی روشنی میں جامعہ کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے تھے، رات کے اندھیرے میں اِسے مزید خوفناک بنارہے تھے۔ پتہ نہیں ہاسٹل والے کیسے رہتے تھے؟

''پانچ لوگ اکیلے نہیں ہوتے'' مقدّم نے تصیح کی تھی۔

''اچھا ہوا رضا نہیں آیا، اتنے بخار میں بیچارہ پیدل کیسے چلتا؟'' حسین کو اچانک ہی اُسکا خیال آیا تھا۔

''اُسے بخار ہے؟'' جیبوں میں ہاتھ ڈالے نوید نے پیچھے مڑ کر حیرت سے اُسے دیکھا۔ وہ چلتے چلتے حسین سے آگے آگیا تھا۔

''ہاں! بتاتو یہی رہا تھا۔'' حسین نے کہا۔

''یار! آج مجھے بتا ہی دو کہ اُسکے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟'' سرکیولر روڈ پر رکتے ہوئے مقدّم نے پوچھا تھا۔

''بیمار ہے وہ'' اُس نے عام سے لہجے میں کہا۔ باقی سب بھی وہیں رک گئے۔

''پچھلے چھ مہینوں سے میں یہی سن رہا ہوں کہ وہ بیمار ہے۔ بلکل اچانک ہی وہ ہم سب کے درمیان سے غائب ہو جاتا ہے، ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتا، بلانے پر بھی نہیں آتا اور تم ہر بار یہی کہہ دیتے ہو کہ وہ بیمار ہے'' مقدّم کی آج برداشت جواب دے گئی تھی۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں بھی تو تمہارے ساتھ ہی ہوتا ہوں'' اُس نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔

''لیکن تم یہ تو بتا سکتے ہو ناں کہ اُسے ہوا کیا ہے؟ بیمار ہے تو بیماری کی نوعیت کیا ہے؟ اُسے کسی مدد کی ضرورت ہے تو ہم ہیں ساتھ۔۔۔ لیکن ہمیں معلوم تو ہو کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟'' اب کہ نوید نے بھی پوچھا۔ سنسان جامعہ میں اُنکی آوازیں گونج رہی تھیں۔

''یار! تم لوگ تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں اُسکے ساتھ رہتا ہوں'' حسین چڑ گیا۔

''ہاں! کیونکہ تم ہی ہو، جو ہمیں یہ بتاتے رہتے ہو کہ وہ بیمار ہے، اُسے بخار ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہم میں سے کوئی بھی اُس سے سوال کرنے کی کوشش کرتا ہے تو تم موضوع بدل دیتے ہو۔ کچھ تو ہے جو تمہیں معلوم ہے لیکن تم ہمیں بتانا نہیں چاہتے'' علی بھی اُسکے سامنے آتے ہوئے بولا۔ وہ آج اُسے چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ جب بات نکل ہی گئی تھی تو اب اسے حل کرنا ضروری تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے''اُس نے تحمل سے کہا۔

''کیا ہم اُسکے دوست نہیں ہیں؟''مقدم نے پوچھا۔

''کیوں نہیں ہو؟''

''تو پھر ہم سے کیوں چھپا رہے ہو کہ اُسکے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟'' بات نوید نے مکمل کی۔

''کیونکہ اگر وہ بتانا مناسب سمجھتا تو خود بتا دیتا'' حسین کا ضبط جواب دے گیا تو وہ چیخ اٹھا۔اُن لوگوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔یعنی وہ صحیح تھے؟

''یعنی کوئی مسئلہ ہے۔اور تم ہم سے چھپا رہے تھے اب تک'' علی کو غصّہ آیا۔

''میں نے کہا تو ہے کہ وہ بتانا چاہے گا تو خود بتا دیگا۔''اُس نے تھک کر ہار مان لی،اور سڑک کے ساتھ بنے ڈپارٹمنٹ کے جنگلے سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔

''حسین! کیا معلوم کہ ہم کچھ کر سکتے ہوں؟ کیا معلوم ہمیں بتا دینے سے، ہم اُسکے مسئلے کا کوئی حل نکال سکیں؟''نوید نے سمجھانا چاہا۔

''اگر مجھے لگتا کہ تم لوگ کچھ کر سکتے تو میں تم لوگوں کے پوچھنے سے پہلے بتا دیتا۔جس دن مجھے لگے گا کہ تم میں سے کوئی اُسکے لئے کچھ کر سکتا ہے تو میں خود بتا دوں گا'' وہ یہ بات ختم کرنا چاہتا تھا پر کر نہیں پا رہا تھا۔

''اور تم یہ فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہو؟ ہم اُسکے لئے کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں یہ فیصلہ ہمیں کرنے دو۔ہم اُس سے خود سوال کرنا چاہتے ہیں تو تم وہ بھی نہیں کرنے دیتے۔ہم اُسکے دوست ہیں حسین!''علی کو اُسکی بات پسند نہیں آئی۔

''رضا نے منع کیا ہے''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''ایسا بھی کیا ہو گیا ہے کہ ہم جان نہیں سکتے؟''مقدّم زچ ہو گیا تھا۔

''کچھ بہت برا ہوا ہے اُسکے ساتھ، مت تنگ کرو اُسے۔اُسے صحیح لگے گا تو خود بتا دے گا۔''اِس ساری گفتگو میں پہلی بار حصّہ لیتے، عمر نے اُن سب کو حیران کیا تھا۔

''کیا مطلب؟''حسین نے سیدھے ہوتے ہوئے پوچھا۔عمر کو کیا معلوم تھا آخر؟

''میں نے اُسے کچھ ماہ پہلے سڑک کنارے بیٹھ کر روتے ہوئے دیکھا تھا۔وہ بہت بری طرح رو رہا تھا مقدم! میں نے اُس دن سے پہلے اور اُس دن کے بعد کبھی اُسے اُسطرح کی حالت میں نہیں دیکھا۔''عمر بول رہا تھا اور باقی سب سن تھے۔پھر اُس نے انہیں اُس رات والا واقع بتادیا۔

''یااللہ! کیا چھپا رہے ہو آخر تم تینوں''نوید نے کہا تھا۔

''میں کچھ نہیں چھپا رہا۔اُس نے مجھے واقعی کچھ نہیں بتایا تھا''عمر نے کہا۔

''تمہیں پوچھنا چاہیے تھا اُس سے''علی کو دکھ ہوا۔

''اور تم کیوں کچھ نہیں بتاتے؟''مقدم کو ایک بار پھر حسین پر غصہ آیا تھا۔

''میں نہیں بتا سکتا۔میں نے وعدہ کیا ہے اُس سے۔۔۔''وہ بے بس ہوا۔

''وہاں کیا ہو رہا ہے؟''اِس سے پہلے کوئی کچھ کہتا، علی یکدم ہی بولا۔وہ لوگ سرکیولر روڈ کی اِس جانب تھے۔سرکیولر روڈ کی دوسری جانب سنگ مرمر کے چکور ستون پر انگریزی میں "فارمیسی" لکھا ہوا تھا۔یہ فارمیسی کی پرانی عمارت تھی۔اس ستون کے پاس ایک لڑکی کھڑی تھی،اندھیرے میں لڑکی کا چہرہ غیر واضع تھا۔لڑکی کے سامنے ایک سیاہ رنگ کی گاڑی تھی جو کہ دو نوجوان لڑکوں کے ملکیت نظر آرہی تھی۔ایک کا چہرہ واضح نظر آرہا تھا،کیونکہ وہ گاڑی سے باہر تھا اور اُسکے چہرے پر ہیڈ لائٹ کی روشنی پڑ رہی تھی۔جبکہ دوسرا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا،چہرے پر رومال بندھا ہونے کی وجہ سے اُسکا چہرہ واضح نہیں تھا۔

''یہ تو عاصم ہے''مقدّم نے پہچانتے ہوئے کہا۔عاصم کسی سیاسی طلباء تنظیم کا چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔

''یہ کر کیا رہا ہے آخر؟''عمر نے آہستہ آواز میں پوچھا۔ایک تو وہ لوگ سڑک کی دوسری جانب تھے اور اُس پر سے اندھیرے میں کھڑے ہونے کی وجہ سے وہ کسی کو دکھائی بھی نہیں دے رہے تھے۔

''صاف نظر آرہا ہے کہ وہ لڑکی کو حراساں کر رہا ہے۔''حسین نے کہا۔

''کچھ بھی واضع نہیں ہے، ہمیں نہیں پتہ وہاں کیا ہو رہا ہے''نوید نے حقیقت پسندی سے بات کی تھی۔

''لیکن ہمیں جا کر پوچھنا چاہیے''علی نے کہا۔

''ہاں! اگر وہ سچ میں لڑکی کو حراساں کر رہا ہو گا تو ہو سکتا ہے کہ ہمیں دیکھ کر بھاگ جائے''عمر نے تائید کی۔اس سے پہلے کہ کوئی بھی ایک قدم آگے بڑھاتا لڑکی کی دلسوز چیخ سنائی دی اور اُسی لمحے عاصم نے کھینچ کر لڑکی کو گاڑی کے اندر کیا۔ گاڑی کا دروازہ بھی پوری طرح بند نہیں ہونے پایا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا لڑکا اُنکی آنکھوں کے سامنے سے گاڑی زن سے لے اُڑا تھا۔

''ارے۔۔۔''وہ ہکا بکا رہ گئے، پھر اگلے ہی لمحے کچھ بھی سمجھے بنا گاڑی کے پیچھے دوڑے لیکن وہ بہت تیزی سے نکلا تھا۔

''نمبر پلیٹ کی تصویر لو''نوید چیخا۔ عمر نے تندہی سے کیمرے سے تصویر کھینچی، صد شکر کہ کیمرہ اُسکے ہاتھوں میں ہی تھا۔

''شٹ۔۔۔ تصویر غیر واضع ہے''عمر نے تصویر دیکھتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

''میں نے نمبر پلیٹ یاد کر لیا ہے''حسین نے فوراً کہا۔

''ہمیں انتظامیہ کو خبر کرنی چاہیے، لڑکی اغوا ہوئی ہے''مقدّم نے کہا۔

''انتظامیہ کو اگر ہوش ہوتا تو ایسا ہوتا ہی نہیں''علی نے غصّے سے کہا تھا۔ وہ لوگ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ خاموش فضا میں اُنکی آوازیں گونج رہی تھی۔

''کاش پہلے وہاں پہنچ جاتے''عمر کو افسوس ہو رہا تھا۔ اُنہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک لڑکی کو اغوا ہوتے دیکھا اور کچھ کر نہ سکے تھے۔ بے بسی کی انتہا تھی۔۔۔

''پہلے پہنچ کر بھی کیا کر لیتے؟ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہوا ہے''نوید نے کہا

''ہمیں کم از کم پولیس کو اطلاع دینی چاہیے''علی نے کہا تو باقی سب نے بھی تائید کی تھی۔ ایڈمن بلاک پہنچ کے اُنہوں میں اپنی گاڑیاں لیں اور سب سے پہلے قریبی تھانے پہنچے۔ وہاں اُنہوں نے آنکھوں دیکھا سارا حال بیان کیا، گاڑی کا نمبر پلیٹ بھی بتایا لیکن پولیس والوں نے ایف آئی آر نہیں کاٹی تھی۔

''نہ آپکو لڑکی کا نام معلوم، نہ اُسکا حلیہ معلوم صرف شک کی بنا پر کیسے ایف آئی آر کاٹ دیں؟'' کانسٹیبل نے بیزاری سے کہا۔

''ہم آپکو اُس لڑکے کا نام اور اُسکی گاڑی کا نمبر بتا رہے ہیں، آپکو اُسکا پیچھا کرنا چاہئے، لڑکی اُسی گاڑی میں ہے اور اُسکے ساتھ کچھ برا بھی ہو سکتا ہے'' عمر نے کہا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم اُس لڑکے عاصم پر الزام لگا رہے ہو'' پولیس والے نے بھنویں اچکاتے ہوئے کہا۔

''آپ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آپکو اُس لڑکی کو تلاش کرنا چاہیے'' علی نے غصّے سے کہا۔

''تم لوگ اتنا کیوں پریشان ہو رہے ہوں؟ بہن لگتی ہے تمہاری؟'' پولیس والے نے خباثت سے کہا تو علی کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو'' علی کی آواز بلند ہوئی۔

''ہم نے تمہاری بات سن لی ہے، کوئی اطلاع ملے گی تو بتا دیں گے۔ ہمیں ہمارا کام مت سکھاؤ'' کانسٹیبل نے درشتی سے کہا۔

''چلو علی! صاف نظر آرہا ہے یہ ایف آئی آر کاٹنے کے موڈ میں نہیں ہیں'' نوید نے اُسکے سینے پہ ہاتھ رکھ کر اُسے پیچھے ہٹایا تھا۔ کانسٹیبل ویسے ہی سکون سے بیٹھا رہا۔ وہ سب تھک کر باہر آ گئے۔

''کس قسم کے بے حس لوگ ہیں؟ کسی اور ملک کا ادارہ ہوتا تو اب تک اس گاڑی کا پیچھا کرنے نکل چکا ہوتا۔'' عمر نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ اس وقت اپنی بے بسی پر رونے کو دل کر رہا تھا۔ سامنے کھڑے ہو کر بھی وہ لوگ کچھ نہیں کر پائے تھے۔

''یہی تو مسئلہ ہے کہ ہم کسی اور ملک میں نہیں ہیں۔'' مقدّم نے افسوس سے کہا تھا۔

اُس رات وہ لوگ گھر تو آ گئے، پر رکے نہیں۔ علی نے اپنے باپ سے مدد مانگی، خلاف توقع اُنہوں نے نہ صرف مدد کی بلکہ اپنے تعلقات کا استعمال کر کے ایف آئی آر بھی درج کروا دی۔ ایف آئی آر درج کروانے کے اگلے ہی دن جو سب سے بڑا دھچکا اُنہیں ملا تھا وہ یہ کہ، جو نمبر پلیٹ اُنہوں نے بتایا تھا، اُس نمبر پر کوئی گاڑی رجسٹرڈ نہیں تھی۔ وہ جعلی نمبر پلیٹ تھا۔

''نہ تو اس لڑکی کے گھر والوں میں سے کوئی آیا، نہ کسی نے رپورٹ لکھوائی۔ اوپر سے نمبر پلیٹ بھی غلط ہے۔ مجھے تو لگتا ہے آپ لوگوں کو کوئی شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ رات کا وقت تھا، ویسے بھی جامعہ کراچی میں جن جنّات گھومتے ہیں۔ آپ لوگوں کے ساتھ بھی ہو گیا ہو گا

کوئی ایسا ہی واقعہ جسے سچ سمجھ بیٹھے ہیں۔''پولیس انسپکٹر ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ اُنکی آنکھوں دیکھے حالات کو غلط فہمی کا نام دے رہا تھا۔ مزید وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا دل پر پتھر رکھ کر خاموشی اختیار کرلی۔

کتنے ہی دنوں تک یہ واقعہ اُنکے ذہنوں سے نہ نکلا تھا۔

جب بہت مشکلوں سے جب وہ اپنے ذہن سے اِس حادثے کو نکالنے میں کامیاب ہوئے، تب قسمت نے اُنکے ساتھ ایک بہت بڑا کھیل کھیلا۔۔۔

تقدیر اُنکا امتحان لینے آ کھڑی ہوئی تھی۔۔۔

--------+-------+------

سانحے کے ڈیڑھ ماہ بعد

وہ مقدم کے نکاح کی خوشی میں دی گئی دعوت سے واپس آیا تھا۔ آتے ہوئے اُسے دیر ہوگئی تھی، لہٰذا اُسے یقین تھا کہ سب گھر والے سو گئے ہونگے۔ لیکن۔۔۔

وہ گھر آیا تو تقریباً سب ہی، گھر کے واحد ٹی وی کے سامنے جمے بیٹھے تھے۔

''یہاں کیا چل رہا ہے؟'' وہ حیران ہوتا اندر داخل ہوا۔ کسی نے بھی اُسکے آنے کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ ٹی وی پر نیوز چینل لگا ہوا تھا۔ کوئی بوڑھا آدمی کیمرے کے سامنے آنسوؤں سے تر آنکھوں کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ

''ڈیڑھ ماہ ہو چکے ہیں، میری بیٹی کا کچھ پتہ نہیں۔ پولیس والے ایف آئی آر نہیں کاٹتے۔ کہتے ہیں کہ بھاگ گئی ہوگی کسی کے ساتھ۔۔۔ ایسی نہیں ہے میری بیٹی۔۔۔ ایسی نہیں ہے۔۔۔'' وہ شخص کہتے ہوئے رو دیا تھا۔

''آپ یہ بتائیں کہ آخری بار آپ کی اُس سے کب اور کیا بات ہوئی تھی؟'' رپورٹر نے مائیک اُسکے منہ کے قریب کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہم تو گاؤں میں رہتے ہیں، اور وہ شہر میں جامعہ کے ہاسٹل میں رہتی تھی۔ آخری بار اپنی روم میٹ کی بہن کی مایوں میں جانے سے پہلے مجھ سے بات کی تھی، ہاسٹل والوں سے اجازت بھی لی تھی اُس نے، اُسکے بعد سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔''

''اُسکی دوست یا ہاسٹل والوں سے کوئی بات ہوئی؟'' رپورٹر نے پوچھا۔

''دوست سے بھی کوئی بات نہیں ہوئی، اور ہوسٹل والے اب اپنی بات سے مکر رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے اُسے کوئی اجازت نہیں دی تھی۔ حالانکہ مجھ سے خود ہاسٹل کی وارڈن نے کال کر کے پوچھا تھا کہ میری بیٹی مجھ سے پوچھ کر جارہی ہے یا نہیں؟ میں نے کہا ہاں! مجھے بتا کر جارہی ہے۔ اب وہ اِس بات کا سرے سے انکار کر رہے ہیں۔ کوئی مجھے انصاف نہیں دلوا رہا۔ میں کیا کروں؟ میری بچی واپس لادو کوئی۔۔۔'' وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ نوید بھی اپنا لباس تبدیل کیے وہیں آ بیٹھا تھا۔

''ہماری عوام سے پرزور گزارش ہے کہ ہر صورت میں اس مجبور باپ کی آواز حکومت تک پہنچائی جائے اور اُسکی بیٹی کو گھر لایا جائے۔ ہمیں صنوبر کاشف کے لیے انصاف چاہیے۔'' رپورٹر اب چلا چلا کر بول رہا تھا۔ جبکہ نوید کا سانس لڑکی کے نام پر رکا تھا۔

''صنوبر کاشف، ایک غریب ڈرائیور کی بیٹی، جسکے بڑے بڑے خواب تھے اور وہ اپنے خوابوں کو حاصل کرنے کے لیے جدوجھد کر رہی تھی۔ اپنے علاقے اور خاندان کی پہلی لڑکی جو کالج سے یونیورسٹی تک پہنچی تھی۔ آج وہی صنوبر پچھلے ایک ماہ سے لاپتہ ہے اور متعلقہ ادارے کسی بھی قسم کا تعاون کرتے نظر نہیں آرہے ہیں۔۔۔'' اب نیوز کاسٹر گلا پھاڑ کر خبر پڑھ رہی تھی۔ اور نوید مٹّی کا مجسمہ بنا ٹی وی کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں اب لڑکی کی کچھ تصاویر بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس چہرے کو بھلا وہ کیسے بھول سکتا تھا؟ کانوں میں ایک ہی آواز کی بازگشت تھے۔

''صنوبر کاشف''

--------+-------+------

''صنوبر؟'' علی حیرت سے کنگ ٹی وی کو دیکھ رہا تھا۔ ہر نیوز چینل پر صرف یہ ہی خبر چل رہی تھی۔ چند ہی گھنٹوں میں یہ خبر ملک کی سب سے زیادہ کوریج والی خبروں میں آگئی تھی۔ صنوبر کی گمشدگی، وہ کون تھی؟ کونسی جامعہ میں پڑھتی تھی؟ اُسکے کتنے دوست تھے؟ غرض ہر چینل پر بس صنوبر نامہ ہی چل رہا تھا۔

''ابّا!۔۔۔'' اگلے ہی لمحے علی الٹے قدموں اپنے باپ کے کمرے کی جانب بھاگا تھا۔

صنوبر کاشف، اُسکے باپ کے سب سے پرانے اور وفادار ڈرائیور کی بیٹی۔۔۔۔

------+------+-------

گمشدگی کی خبر کے ایک ہفتے بعد:

''ہم آپ کو یہاں بتاتے چلے کہ صنوبر گمشدگی کیس نے ایک نیا موڑ اختیار کیا ہے۔پولیس حکام اور ایف آئی اے کی مشترکہ کارروائی کے بعد، پولیس کو جامعہ کراچی کے اسٹاف سوسائٹی کے خالی پڑے گھروں کے پاس سے ایک لڑکی کی تشدّد زدہ لاش ملی ہے۔لاش کو فرانزک کے لیے سِول ہسپتال پہنچادیا گیاہے۔مزید برآں کہ لاپتہ ہونے والی لڑکی صنوبر کے والد کو بھی شناخت کے لیے ہسپتال بلایا گیا ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ لاش صنوبر ہی کی ہے؟اور اگر یہ صنوبر کی لاش نکلتی ہے تو پھر کیا ہوا اُسکے ساتھ؟کیسے مری وہ؟ طبعی موت یا قتل؟ دشمنی یا کوئی اور راز؟بے شمار سوالات جنم لیں گے اِس ایک لاش کے ساتھ۔۔۔ہم آپکو لمحہ بہ لمحہ۔۔۔''پرجوش سی نیوز کاسٹر صنوبر کے کیس میں آنے والے اِس نئے موڑ پر اطلاع دے رہی تھی۔نوید ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

پچھلے ایک ہفتے سے اُسکا یہی معمول تھا۔وہ دن رات ٹی وی کے آگے بیٹھے،بس صنوبر کی خبریں سنتا رہتا۔اُسکے گھر والے بھی بیزار ہونے لگے تھے۔مگر وہ تو جیسے کھانا پینا سب بھول گیا تھا۔پچھلے ایک ہفتے سے وہ مسلسل صنوبر کی صحیح سلامت گھر واپسی کی دعا کر رہا تھا۔لیکن ابھی ابھی ملنے والی اس لاش کی خبر نے جیسے اسکو کسی گہری کھائی میں اٹھا کر پھینک دیا تھا۔وہ صوفے سے اُٹھ گیا اور بے چینی سے یہاں وہاں ٹہلنے لگا۔کسی طور سکون نہیں آرہا تھا۔

کسے بتاتا؟

کس سے کہتا؟

اُس کی ہر شے اپنے اندر رکھنے والی عادت نے اُسے آج اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا، لیکن کسی کو بتا نہیں سکتا تھا۔

صنوبر۔۔۔

اُسکی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی جسے اُس نے پسند کیا تھا۔

وہ پہلی لڑکی جس کی خواہش اپنے ماں باپ سے کی تھی۔

اور انہوں نے نام تک سننا ضروری نہ سمجھا اور انکار کر دیا تھا۔

جو گھنٹوں اُسکے ساتھ بیٹھ کر شیکس پیئر اور اگا تھا کرسٹی کے ناولز پر بحث کرتی تھی۔

جسکو وہ اپنے اسائنمنٹ اور اپنی پریزنٹیشن کے مواد بخوشی دے دیتا تھا۔

جسکے ساتھ اُس نے اپنے خوابوں کا گھر بنانے کی خواہش کی تھی۔

صنوبر جسے وہ بھول جانا چاہتا تھا، لیکن ٹی وی پر چلتی اُسکی موت کی خبر نے اُسے اپنا آپ ہی بھلا دیا تھا۔

--------+-------+------

گمشدگی کی خبر سے ڈیڑھ ہفتے بعد:

جو بات وہ سننا نہیں چاہتا تھا وہ ہو گئی تھی، جس شے سے وہ نظریں چرا رہا تھا وہی سامنے آئی تھی۔

تین دن پہلے ملنے والی لاش صنوبر کی ہی تھی۔

"صنوبر کو زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اُسے تشدد کر کے قتل کر دیا گیا تھا۔ ملزمان نے جامعہ کراچی کے ہاسٹل میں رہنے والی صنوبر کاشف کو قتل کرنے کے بعد پاس ہی جھاڑیوں میں پھینک دیا تھا۔ کچھ لوگوں کی نشان دہی پر، تین دن پہلے ملی گی لاش صنوبر کاشف کی ہی نکلی ہے۔ ہم آپکو بتاتے چلیں کے صنوبر کاشف کیس نے ایک نیا موڑ اختیار کر لیا ہے۔ "ہر چینل پر بس یہی خبر تھی۔ صنوبر بے دردی سے قتل ہو چکی تھی۔ یہ خبر ٹاپ ریٹیڈ بنتی جا رہی تھی۔

نوید دو روز سے کمرے میں بند تھا۔ نہ آفس گیا، نہ کھانا کھانے کے لیے کمرے سے باہر آتا۔ علی کی شادی قریب تھی۔ پر وہ بیچارہ سب چھوڑ چھاڑ، صنوبر کے باپ کی اس کیس میں ہر ممکن مدد کر رہا تھا۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ علی کا باپ بھی اُس کے ساتھ کھڑا تھا۔ اِسی چیز نے اُسکے حوصلے بڑھا دیئے تھے۔ وہ ہر صورت میں صنوبر کو انصاف دلوانا چاہتا تھا۔

لیکن نوید؟ نوید کا تو دل ہی مردہ ہو چکا تھا۔ پاس پڑا موبائل چیخ چیخ کر بند ہو چکا تھا۔ وہ اسی طرح بستر پر چاروں شانے چت لیٹا چھت کو دیکھتا رہا۔ موبائل ایک مرتبہ پھر بجا تو اُسکے وجود میں جنبش ہوئی۔ گردن موڑ کر پاس رکھے موبائل کو دیکھا۔

عمر کی کال تھی۔ فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

''کہاں گم ہو گئے ہو بھئی؟ صبح سے سب تمہیں کال کر رہے ہیں۔ سب خیریت ہے نہ؟''عمر نے ایک ہی سانس میں سارے سوالات کر ڈالے۔

''ہاں!''اُس نے مختصراً اپنی خیریت بتائی۔ ایک ہاتھ سے وہ اپنی پیشانی کو مسل رہا تھا۔

''تم ٹھیک ہو''اب کہ اُس نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔

''ہاں! میں ٹھیک ہوں بلکل، بس آفس میں تھوڑا کام زیادہ ہونے کی وجہ سے مصروف تھا''اس نے صاف جھوٹ بولا۔

''کیا تم مجھے آج رات مل سکتے ہو؟''

''آج رات؟ کیوں؟''وہ اُٹھ بیٹھا۔ عمر کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جس نے اُسے مشکوک کیا تھا۔

''بس کچھ بہت ضروری ہے، تم میرے گھر پہنچ جانا''اُس نے عجلت میں کہہ کر کال کاٹ دی تھی۔ نوید حیران ہوا تھا۔

اُس وقت نہ نوید اور نہ ہی عمر جانتا تھا کہ حالات انکو کس رخ پر لیکر جانے والے ہیں۔

وہ ذہنی طور پر بہت تھک چکا تھا، اُسکے اندر جو کچھ چل رہا تھا، وہ اُسے نکال نہیں پا رہا تھا۔ اور یہ چیز اُسے بری طرح توڑ رہی تھی۔ رات کو وہ کافی مشکلوں سے عمر کے گھر پہنچا۔ وہاں رضا سمیت سب ہی موجود تھے، بس اُسی کا انتظار ہو رہا تھا۔ اُن سب کے موجود ہوتے بھی، وہاں ایک گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی، خلاف توقع حسین اور مقدّم بھی خاموش بیٹھے تھے۔

''السلام وعلیکم!''وہ اندر داخل ہوتے مقدّم کے برابر بیٹھا۔ سب نے سلام کا جواب دیا۔

''کیا ہوا ہے؟ اتنی ایمرجنسی میں کیوں بلایا اور کچھ بتایا بھی نہیں؟''اُس نے عمر سے پوچھا۔

''فون پر کرنے والی بات نہیں تھی ناں''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''تم لوگوں کو یاد ہے کہ یونیورسٹی کی بارن فائر والی رات ہم نے عاصم کو دیکھا تھا؟ جو ایک لڑکی کو زبردستی اغوا کر کے لے گیا تھا۔''عمر نے پوچھا۔ بھلا وہ کیسے بھول سکتے تھے؟

''وہ لڑکی صنوبر تھی''عمر نے آہستہ سے کہا تھا۔نوید کو اپنے پیروں تلے زمین نکلتی محسوس ہوئی تھی۔

''تو یعنی۔۔۔تم لوگ اس واقعے کے چشم دید گواہ ہو؟''رضا نے پوچھا۔

''ہاں!تمہارے علاوہ ہم پانچ بندے جانتے ہیں کہ مجرم عاصم ہے۔''عمر نے کہا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔۔۔''علی صدمے سے کہہ رہا تھا۔

''ہم نے جس لڑکی کو دیکھا وہ صنوبر تھی اور دیکھو ہم کچھ بھی نہیں کر سکے''اُسے بے انتہا افسوس ہوا تھا۔صنوبر اُسکے سامنے بچپن سے پلی بڑھی تھی۔پہلے وہ لوگ اُنکے کوارٹر میں رہتے تھے۔پھر جب صنوبر کے والد کو فالج کا اٹیک ہوا،تو انہوں میں ڈرائیونگ چھوڑ دی اور گاؤں چلے گئے،علی کے ابّا اُنکا بہت خیال رکھتے تھے۔ماہانہ خرچہ بھی دیتے تھے۔اُن دنوں صنوبر جامعہ میں داخلہ لے چکی تھی،لہٰذا وہ گاؤں جانے کے بجائے ہاسٹل منتقل ہو گئی تھی۔

''اُس وقت ہمارے بس میں جو کچھ تھا،وہ ہم نے کیا۔اُس وقت ہم اُس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔لیکن اب ہم کر سکتے ہیں''عمر نے کہا۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟''مقدّم نے پوچھا۔

''ہم چشم دید گواہ ہیں،ہم مجرم کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔''حسین نے جواب دیا تھا۔

''بلکل!ہم کر سکتے ہیں اور ہم یہ کرینگے۔''عمر نے کہا۔

''لیکن کیا وہ ہماری بات سنیں گے؟اور وہ ہمارا ساتھ دیں گے؟''حسین نے تشویش کا اظہار کیا۔

''انکو دینا پڑیگا،یہ ایک ہائی پروفائل کیس ہے۔اگر حکومت نہیں دے گی،تو ہم میڈیا کا سہارا لیں گے''رضا نے کہا۔اس تمام معاملے میں وہ براہِ راست شامل نہیں تھا،لیکن وہ خود کو اس سے الگ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

''لیکن ہمیں کرنا کیا ہے؟''حسین نے پوچھا۔

''مجھے کل تک کا وقت دو، میں ابّا سے اس بارے میں بات کرتا ہوں۔ اُنکے پاس یقیناً کوئی نہ کوئی حل ہو گا''، علی نے سب کو تسلی دی تھی۔

اس سارے معاملے میں نوید دم سادھے بیٹھا تھا۔ سب ہی نے یہ بات نوٹ کی تھی۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' عمر نے اُسے مخاطب کیا۔

''ہو نہہ۔۔۔'' اُس نے چونکتے ہوئے اُسے دیکھا۔ نظریں خالی خالی تھیں۔

''طبیعت ٹھیک ہے نا تمہاری؟'' مقدّم نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں سب ٹھیک ہے۔'' اُس نے کہا پھر رک کے ایک نظر سب کو دیکھا۔ وہ اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اُسے توجّہ کا مرکز بننا پسند نہیں تھا۔ اُسے کبھی توجہ نہیں ملی تھی، لٰہذا وہ اسکا عادی بھی نہیں تھا۔ اگر سب کی نگاہیں اُس پر مرکوز ہوتیں تو اُسکا دم گھٹنے لگتا تھا۔

''مجھے کام ہے کچھ، میں چلتا ہوں'' وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا سب حیرت سے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔ ''کوئی پیش رفت ہو اس معاملے میں تو مجھے بتا دینا، اللہ حافظ'' اپنی بات مکمل ہونے کے بعد وہ کسی کا جواب سننے کے لیے وہاں رکا نہیں تھا۔

''اسے کیا ہوا ہے؟'' عمر نے سوالیہ انداز میں علی کو دیکھا۔

''ظاہر ہے، صنوبر والی بات پر پریشان ہو گا۔ میں پوچھوں گا اس سے، فکر نہ کرو'' علی نے تسلی دی لیکن نوید کے رویّے سے وہ خود بھی پریشان تھا۔

دوسری طرف گھر سے باہر نکلتے نوید کے اندر غصّے کا اُبال اُٹھ رہا تھا۔ وہ اتنا مشتعل تھا کہ اُسکا بس نہیں چل رہا تھا، عاصم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ صنوبر اُسکے سامنے تھی، اُسکی آنکھوں کے سامنے اور وہ کچھ نہ کر سکا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ وہ واقعی کسی کام کا نہ تھا۔ آج اُسے حقیقتاً اپنا آپ بیکار اور ناکارہ لگا تھا۔ دو مرتبہ اُسکی بائیک پھسلی تھی۔ اُسے خراشیں آئی تھیں۔ لیکن اُسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

جو آگ اُسکے اندر لگ چکی تھی اُس سے وہ ساری دنیا کو جلا دینا چاہتا تھا، لیکن یہ آگ اب اُسے کتنا جلانے والی تھی، اِس بات سے وہ بے خبر تھا۔

--------+-------+------

سانحے کے دو مہینے بعد:

وہ پانچوں اس وقت وکیل استغاثہ کے سامنے بیٹھے تھے۔ یہ وکیل سفیر صاحب نے صنوبر کے کیس کے لئے ہائر کیا تھا۔اس وقت وہ اُنہیں وکیلِ دفاع کے سوالات کے لیے تیار کر رہا تھا۔

''یہ کیس صنوبر اور عاصم کا نہیں رہا، بلکہ حکومت اور اپوزیشن کی جنگ بن چکی ہے۔ حکومت صنوبر کے کیس کو صرف اس لیے اوُن (سرپرستی) کر رہی ہے، کیونکہ عاصم اُنکے مخالفین کی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔وہ پوری کوشش کریں گے یہ الزام لگانے کی کہ تم سب حکومت کی پارٹی سے تعلق رکھتے ہو، اور اُنہیں برا بنانے کے لئے اُنکے پارٹی ورکر پر الزام لگا رہے ہو۔'' وکیل استغاثہ اُنہیں سمجھا رہے تھے۔

''ہم تو بس ایک مظلوم کو انصاف دلانا چاہتے ہیں۔ ہم نے تو اس وقت بھی ایف آئی آر درج کروانے کے لیے سر توڑ کوششیں کی تھی، جب ہمیں معلوم بھی نہ تھا کہ وہ لڑکی صنوبر ہے'' عمر نے کہا۔

''ہاں! لیکن سیاست ایک بہت گندا کھیل ہے۔اور بد قسمتی سے تم سب بھی اسکا حصّہ بن چکے ہو۔ابھی تک ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ میڈیا کی کوریج نہ ملے تم سب کو، اگر میڈیا کے پاس تم سب کی تصاویر یا نام غلطی سے بھی پہنچ گئے، تو اُسکے بعد نہ صرف تم سب بلکہ تمہارے خاندان کی جانوں کو بھی خطرہ ہو گا۔ تم لوگوں کو ہر صورت میڈیا سے دور رہنا ہے اور کیس پر توجہ دینی ہے۔''

''ہمارا کیس مضبوط ہے یا کمزور؟'' علی نے پوچھا۔

''کمزور ہے، کیونکہ ہم کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے۔ البتہ ہماری پوری کوشش ہو گی کہ عاصم کا جسمانی ریمانڈ منظور کروالیں۔ اُمید ہے کہ شاید وہ زبان کھول دے۔ ابھی ہمارا پہلا کام جسمانی ریمانڈ لینا ہے۔ پہلی پیشی پرسوں ہے۔ پرسوں جمعہ ہے، جبکہ فرانزک رپورٹ اتوار تک آئیں گی۔''

''اُس سے کیا ہو گا؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''فرانزک سے ہمیں عاصم کے فنگر پرنٹس وغیرہ مل سکتے ہیں۔اگر ایسا ہوا تو ہمارا کیس مضبوط ہو جائیگا۔ابھی فلحال تم لوگوں نے وکیل صفائی کے آگے ہار نہیں ماننی'' وہ سمجھا رہے تھے۔عاصم زیر حراست تھا لیکن منہ نہیں کھول رہا تھا۔معاملہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ان سب میں اب ہوسٹل کی وارڈن اور صنوبر کی وہ دوست جو اسے اپنی بہن کی شادی پر لے گئی تھی، دونوں کو ملوث قرار دیا گیا تھا۔

وہ لوگ بھی اپنی اپنی زندگیوں کو پس پشت ڈالے، ڈٹ کر کھڑے تھے۔ علی پہلے دن کا دولہا تھا۔ لیکن وہ بھی وہیں تھا۔ کل اُسکا ولیمہ تھا اور پرسوں اس کیس کی پہلی پیشی۔اُسکے باوجود بھی اُنکے ارادوں میں کوئی کمزوری نہیں آرہی تھی۔

لیکن یہ اُنکی بھول تھی کہ وہ حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں۔

--------+-------+------

''مقّی کہاں ہے ؟اب تک آیا کیوں نہیں؟'' تھری پیس میں ملبوس کھڑا علی، عمر سے پوچھ رہا تھا۔

''اُسے ہی کال کر رہا ہوں۔پر وہ اٹھا نہیں رہا'' نیوی بلیو رنگ کے کوٹ پینٹ میں ملبوس عمر نے جواب دیا۔بلاشبہ وہ بہت ڈیشنگ لگ رہا تھا۔اِس وقت وہ لوگ علی کے گھر موجود تھے۔

''میرا شام سے اُس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا ہے۔'' نوید نے کہا تھا۔

''بہت دیر ہو چکی ہے، تمہارے ابّا بار بار نکلنے کا کہہ رہے ہیں'' حسین نے کہا۔

''کیا کریں اب؟'' علی پریشان ہوا۔

''تھوڑی دیر اور انتظار کر لیتے ہیں، اتنا لاپرواہ تو نہیں ہے وہ، کل رات دیر تک جاگتے رہے ہیں ہم سب ہی، کیا معلوم وہ سو رہا ہو'' عمر نے بودی سی تاویل پیش کی تھی۔

''ایسے تو نشہ کر کے بھی نہیں سویا جاتا، رات کے نو بج رہے ہیں'' حسین اُسے جواب دیا۔

''ایک کام کرو تم میں سے کوئی اُسکے گھر دیکھ آؤ۔نہ جانے کیا مسئلہ ہوا ہے؟'' علی نے تجویز پیش کی۔

''صحیح کہہ رہے ہو۔ میں اور نوید اُسکے گھر جا کر دیکھ آتے ہیں۔ تم لوگ ہال پہنچو، ہم اُسے لیکر وہیں آجائیں گے'' رضا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اُسکے بعد وہ دونوں مقدّم کی طرف اور باقی سب ہال کے لیے نکل گئے تھے۔

جب وہ مقدّم کے گھر پہنچے تو وہاں دروازے پر تالا تھا اور باقی سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا تھا۔

''یہ کہاں چلا گیا ہے آخر؟'' نوید نے حیرت سے پوچھا۔ اب وہ حقیقتاً پریشان ہونا شروع ہو گئے تھے۔

''اب تو واقعی میں فکر ہو رہی ہے مجھے۔'' رضا نے کہا۔

''لیلیٰ سے کوئی رابطہ ہے تمہارا؟ کیا پتہ اُس سے کچھ معلوم ہو جائے'' نوید نے اُمید سے پوچھا۔

''میرا بھلا لیلیٰ سے رابطہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' رضا نے جواب دیا

''کیا کرنا چاہیے اب؟ عمر کی کال آرہی ہے بار بار۔۔۔'' نوید جھنجھلا گیا تھا۔

''کیا کر سکتے ہیں بھلا؟ ابھی فنکشن میں شامل ہوتے ہیں، اُسکے بعد دیکھتے ہیں۔'' رضا نے کہا تو نوید نے اُسکی تائید کی۔ فلحال کے لیے تو وہ لوگ ولیمے کی تقریب میں شامل ہو گئے، لیکن اندر سے وہ سب ٹھیک ٹھاک پریشان تھے۔

اگلے دن پیشی تک اُنہوں نے کئی بار جا کے مقدّم کے گھر میں دیکھا لیکن تالا ویسے ہی لگا تھا۔ کل تک تو اُسکے موبائل پر بیل جا رہی تھی لیکن اب اُسکا نمبر بھی بند ہو چکا تھا۔

استغاثہ نے کیس اچھے سے لڑا۔ اُن چاروں کو ہر صورت میڈیا سے دور رکھا گیا تھا، لیکن پھر بھی یہ خبر آگئی کہ ایک گواہ پیشی کے وقت غائب تھا۔ عاصم کا ریمانڈ لے کر اُسے پولیس فورس کے حوالے کر دیا گیا۔

اُسکا اگلا دن مزید پریشانی لے کر آیا، صنوبر کی رپورٹس آگئی تھی، اُسکے جسم پر عاصم کے فنگر پرنٹس ملے تھے۔ وہ ہر طرح سے مجرم ثابت ہو رہا تھا۔ جس پارٹی کا وہ ممبر تھا وہ پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ہر شے اُنکی مرضی کے مطابق تھی

لیکن۔۔۔۔

وہ خوش نہیں تھے۔ کوئی شے اُنہیں بری طرح کھٹک رہی تھی۔

مقدّم کی گمشدگی کے بعد سے وہ لوگ بلکل خاموش تھے۔ نوید کو تو صنوبر کی موت نے توڑ دیا تھا، لیکن وہ چاہ کر بھی کسی سے کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ رضا ویسے ہی غائب رہنے لگا تھا کئی ہفتوں بعد اُن میں سے کسی کو خیال آتا تو اُسے فون کر کے پوچھ لیتا۔ عمر، مقدّم کے لیے مارا مارا پھر رہا تھا، جہاں ممکن تھا وہاں مقدّم کو تلاش کر رہا تھا لیکن اُسکی ہر کوشش بیکار جا رہی تھی۔ علی ہر صورت صنوبر کو انصاف دلانا چاہتا تھا، در حقیقت وہ صنوبر کے لیے بھائی جیسے جذبات رکھتا تھا۔ حسین اس سارے معاملے میں خاموشی اختیار کیے ہوا تھا۔

مقدّم کے جاتے ہی جیسے ہر شے پر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ اور خاموشی کسی بڑے طوفان کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

--------+-------+------

سانحے کے چار ماہ بعد:

پچھلے دو ماہ میں فقط دو پیشیاں ہو سکی تھیں۔ ہر بار کوئی نہ کوئی مسئلہ ہو جاتا تھا۔ شہر کی ہر چھوٹی اور ہر بڑی جامعہ کے طلبہ و طالبات سڑکوں پر نکل کر صنوبر کے حق میں احتجاج کر رہے تھے۔

اس سانحے کو چار ماہ گزرنے کے باوجود بھی یہ میڈیا پر اب بھی پہلے دن کی طرح تازہ تھا۔ مقدّم کو غائب ہوئے بھی دو ماہ ہو چکے تھے۔

دوسری پیشی پر عاصم مجرم ثابت ہو گیا تو استغاثہ کیس بند کروانا چاہتے تھے، لیکن علی اِس پر راضی نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح اُس دوسرے شخص کا نام سامنے لایا جائے، جو اُس رات عاصم کے ساتھ ملوث تھا۔ مزید یہ کہ علی ہر صورت جامعہ سے طلبہ تنظیموں کا خاتمہ چاہتا تھا جو سیاست کی آڑ میں اس طرح کے غلیظ فعل میں ملوث تھیں۔ علی کو اپنے باپ کی مکمل حمایت حاصل تھی اور ایسا شاید پہلی اور آخری بار ہوا تھا۔

البتہ استغاثہ نے اُس روز اُن سب کو جمع کیا تھا۔ رضا نہیں آیا تھا، بس وہ چاروں ہی تھے۔

”تم لوگ صنوبر کو انصاف دلانا چاہتے تھے۔ الحمدُللہ! ہم اِس میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اگلی پیشی میں عاصم کو پھانسی کی سزا ہو جائیگی۔ مبارک ہو تم سب کو“ وکیل استغاثہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا لیکن جواباً وہ سنجیدگی سے بیٹھے رہے تھے۔ علی کے ابّا سفیر صاحب بھی وہیں تھے۔

''تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ مجرم صرف عاصم تھا؟'' سفیر صاحب نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

''دیکھیں! جو مجرم تھا اسکو سزا مل گئی، اب اُسکے ساتھ کون کون تھا؟ اِسکے پیچھے جائیں گے تو سوائے نقصان کے کچھ نہیں ہو گا۔ یہ سب سیاسی کھیل ہیں۔ یہ سیاست دان کسی کے نہیں ہوتے، آپ دیکھ لیں جو کل تک عاصم کے لیے لڑ رہے تھے جیسے ہی جرم ثابت ہوا، اُسکو اکیلا چھوڑ دیا۔'' وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں بہت کچھ سمجھانا چاہ رہے تھے۔

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں، عاصم تو مہرہ تھا۔ اُس مہرے کو سزا دے دینے سے کیا ہو جائے گا؟ اُس مہرے کو چلانے والے ہاتھ ڈھونڈ ھنے ہوں گے، اُسے پکڑنا ہو گا'' سفیر صاحب نے کہا۔

''کیسے پکڑیں گے آپ؟'' وکیل استغاثہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''یہ تو آپ بتائیں''

''یہ میرا کام نہیں ہے۔ اور نہ مجھے ان مسائل میں پڑنا ہے۔ اور بالفرض، میں آپکا ساتھ دے بھی دوں، تب بھی ہم عدالت میں کچھ ثابت نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ دو سیاسی پارٹیوں کی جنگ تھی جو کہ ختم ہو گئی ہے، لیکن اب اگر آپ اس آگ کو دوبارہ بھڑکانا چاہیں گے تو نقصان آپکا ہی ہو گا''

''اس بات کا کیا مطلب؟'' علی کو اب غصّہ آنے لگا تھا ''ہم نے جو دیکھا اُس پر آنکھیں بند کر لیں؟ وہ اصل مجرم تو اب تک آزاد ہے۔ اور نہ جانے وہ اور کس کس کے ساتھ یہی سب کرے؟''

''بیٹا! یہ تو تم کہہ رہے ہو۔ اپنے دوستوں سے پوچھو ایک مرتبہ، کیا وہ بھی یہی چاہتے ہیں؟ تمہارا ایک دوست تو غائب بھی ہو چکا ہے۔ ذرا سوچو! کہ آخر کیا ہوا اُسکے ساتھ، جو وہ پہلی پیشی سے پہلے ہی اپنے پورے خاندان کے ساتھ راتوں رات غائب ہو گیا؟'' علی نے مڑ کر ایک نظر اپنے دوستوں کو دیکھا۔ سب کے سب خاموش تھے۔ اُنکی خاموشی سے وہ کچھ اخذ نہ کر سکا۔ پتہ نہیں کیوں، لیکن اب وہ لوگ اس کیس میں علی جیسی دلچسپی ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ اُسکے دل کو کچھ ہوا تھا یہ دیکھ کے۔ اگلے کئی گھنٹوں تک وکیل استغاثہ اُنہیں یہی سمجھاتے رہے کہ اُنہیں اب اس کیس میں مزید نہیں پڑنا چاہیے لیکن علی اور اُسکے ابّا بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔

''اگلی پیشی پر آپکا مطالبہ بھی جج کے سامنے رکھوں گا۔ لیکن میں سو فیصد یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسکا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔'' جاتے جاتے وکیل استغاثہ کہہ گئے تھے۔ اُنکے جانے کے بعد عمر اور نوید بہت خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔ علی کو اُنکے رویّے سخت حیران کر رہے تھے۔ حسین جانے سے پہلے اُسکے پاس آیا۔

''دیکھو! یہ کیس ایک اعصابی جنگ ہے، اُس پر سے مقدّم کا غائب ہونا، اُس سے بڑی پریشانی ہے۔ ہم سب ہی ذہنی طور پر تھک چکے ہیں۔ مجھے باقی سب کا تو نہیں معلوم البتہ میں آخری وقت تک تمہارے ساتھ ہوں۔ تم جو کر رہے ہو۔۔ صحیح کر رہے ہو۔'' حسین نے اُسکا بازو تھپتھپاتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا بھی نہ سکا۔ وہ کبھی کبھی ایسی باتیں کر دیتا تھا کہ لگتا ہی نہیں تھا وہ حسین ہو۔

وہ جا چکا تھا اور علی تنہا کھڑا آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شاید مستقبل میں اسے ایسے ہی کھڑا رہنا تھا۔۔۔

تنہا۔۔۔

--------+-------+------

سانحے کے پانچ ماہ بعد:

فون کی گھنٹے نہ جانے کتنی دیر سے بج رہی تھی۔ وہ بھی برابر نظر انداز کر رہا تھا۔ مختلف جگہوں پر سی وی دینے کی وجہ سے اُسے روزانہ ہی کہیں نہ کہیں سے انٹرویو کی کال آتی تھیں۔ کچھ سے وہ معذرت کر لیتا تو کچھ کو اسی طرح نظر انداز کر دیتا، جواباً وہ بھی پلٹ کے دوبارہ کال نہ کرتے تھے۔ لیکن یہ کون تھا جو مسلسل اُسے چوتھی مرتبہ کال کر رہا تھا؟

''کون ہے آخر؟'' انگریزی کی کتاب بند کرتے نوید جھنجھلا گیا تھا۔ آج کل وہ سی ایس ایس کی تیاری کر رہا تھا۔ ویسے ہی عاصم اور صنوبر کے کیس میں اُسکا خاصا وقت برباد ہوا تھا۔

''کون بات کر رہا ہے؟'' نوید نے فون کان سے لگاتے ہو پوچھا تھا۔

''تمہاری موت۔۔۔'' وہ جو بھی تھا، ایسے پھنکارا تھا جیسے فون سے باہر نکل کر نوید کا قتل کر دے گا۔

''سوری؟'' اُسے لگا کسی نے اُسکے ساتھ بیہودہ مذاق کیا ہے۔

''اب معافی تلافی کا وقت گیا نوید! اگلی پیشی پر جج میری موت کے پروانے پر دستخط کر دے گا۔ لیکن ایک بات میں تمہیں بتا دوں، میں تو مر جاؤ نگا لیکن تمہارے لیے ایسا گڑھا کھود کر جاؤ نگا کہ نہ تو مردہ اور نہ ہی زندہ اُس میں دفن ہو سکو گے''نا سمجھی سے شاک اور شاک سے بے یقینی میں پل پل بدلتے تاثرات کے ساتھ نوید اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''عاصم۔۔۔؟''اُسکی زبان سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

''ہاں! وہی عاصم جس کو برباد کرنے میں تم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی''عاصم جیل میں تھا، اُسکے پاس فون کہاں سے آیا اور وہ کال کیسے کر رہا تھا اُس کو؟ اسکو نوید کا نمبر کس نے دیا اور سب سے بڑا سوال کہ نوید اُسکی کال سن کیوں رہا تھا؟ اُسے کال کاٹ دینی چاہیے تھی۔ وہ کسی مشکل میں پڑ سکتا تھا۔

''عدالت میں، میں ضرور یہ بات اٹھاؤں گا کہ وہ صنوبر۔۔۔ وہ تمہاری معشوقہ تھی''زہر خند لہجے میں بولتا عاصم اُسکے پیروں تلے زمین نکال گیا تھا۔

''صنوبر کے موبائل سے تمہارے سارے میسج مل جائیں گے۔ پوری جامعہ میں تم ایک ہی لڑکے تھے جس سے وہ بات کرتی تھی۔ اُس دوسرے شخص کا نام جاننا چاہتا ہے نا تمہارا دوست؟''وہ نوید کو کچھ کہنے کے لائق نہیں چھوڑ رہا تھا۔

''میں بتاؤں گا انہیں اُس دوسرے شخص کا نام۔۔۔ تم۔۔۔ تم ہو وہ دوسرے شخص۔۔۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''وہ چاہ کر بھی چلا نہ سکا۔ آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی شاید۔

''ہاں! تم ہی ہو وہ دوسرے شخص اور تمہارے دوست تمہیں بچانے کے لیے میرے سر پر سارا ملبہ ڈال رہے ہیں، یہ چال میں تمہارے سروں پر الٹوں گا۔ تم اب اپنے آپ کو بچا نہیں سکو گے۔''

''جج۔۔۔ جھوٹ۔۔۔ جھوٹ بول رہے ہو تم۔۔۔ تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ میرا کوئی تعلق نہیں ان سب سے''اُس کی سانس پھولنے لگی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس بری طرح پھنسایا جا سکتا ہے۔ جس بات کو اُس نے سب سے چھپا کر رکھا وہ بات ایک مجرم کے ہاتھ لگ گئی تھی اور وہ اُسے، اُسی کے خلاف استعمال کرنے والا تھا۔

"تم نے کیا سمجھ رکھا تھا کہ عاصم کوئی بیکار شے ہے؟ جسے تم لوگ موت کے دہانے پر لے آؤ گے اور وہ تمہیں کچھ نہ کہے گا؟ تم دیکھنا! سب سے پہلے تم پھنسو گے اور پھر تمہارے دوستوں کو تمہاری پشت پناہی کے جرم میں سزا ہو گی۔ میں تم سب سے اس کا بدلہ ضرور لوں گا آج نہیں تو کسی اور وقت پر، مگر چھوڑوں گا نہیں ایسے۔۔۔" وہ پتہ نہیں اور کیا کیا کہہ رہا تھا؟ لیکن نوید نے فون بند کر دیا تھا۔ اس تمام عرصے میں پہلی بار اُسے شدید خوف محسوس ہوا تھا۔ وہ اس حد تک خوف زدہ تھا کہ یہ بھی بھول بیٹھا کہ اُس نے کبھی بھی صنوبر سے کام کی بات کے علاوہ کوئی بات نہ کی تھی۔ اُسکے میسجز سے کوئی بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ صنوبر سے اُسکی دلی وابستگی تھی۔ لیکن اس وقت اُسکا دماغ مثبت سوچنا چھوڑ چکا تھا۔ اُسے یہ سب باتیں نظر نہیں آرہی تھیں۔

اب کیا ہو گا؟ اگر اُس نے سارا ملبہ نوید کے سر پل ڈال دیا تو؟ وہ تو کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اور اُسکا باپ؟ اُسے اپنے باپ کی مار اور ماں کی گالیاں یاد آرہی تھیں۔ وہ وہی چھوٹا نوید بن گیا تھا، جو ہر وقت اپنے ماں باپ سے خوف زدہ رہتا تھا۔ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے کیا کرنا چاہیے؟ اگلی پیشی پر ہر صورت میں عاصم کو پھانسی کی سزا ہو گی اور وہ ہر صورت کیس کا رخ نوید کی جانب موڑ دے گا۔ وہ کیسے بھول گیا کہ سیاسی جماعتیں اتنی آسانی سے کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتی؟ اُس نے پہلے کیوں نہ سوچا؟ کیوں نہ سوچا جب مقدّم راتوں رات غائب ہو گیا تھا؟ کیوں اُس نے ان سب چیزوں کو اتنا آسان سمجھ لیا تھا؟ وہ اتنا بیوقوف کیسے ہو سکتا تھا؟

اپنے کمرے کے عین وسط میں کھڑا نوید اِس وقت ہر ہر نہج پر سوچ رہا تھا۔ مقدّم کی گمشدگی، اس عام سے کیس میں میڈیا اور حکومت کا شامل ہو جانا؟ کیوں نہیں سوچا اُس نے کہ وہ اپنے آپ کو کس دلدل میں پھنسا رہا ہے؟ پوری رات کانٹوں پر گزارنے کے بعد وہ ایک ہی نتیجے پر پہنچا تھا۔

وہ مقدمے سے پیچھے ہٹ جائیگا۔

--------+-------+------

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" علی بے یقینی کی سی کیفیت میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ آخری بار اُن سب کے چہرے دیکھنے پر اُسے سمجھ آگیا تھا کہ یہ وقت اُس پر جلد ہی آنے والا ہے۔ لیکن اتنی جلدی؟

’’جو تم نے سنا‘‘نوید نے سنجیدگی سے جواب دیا۔اُس وقت وہ علی کے گھر پر تھا۔گھر میں اُن دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

’’کیوں نوید؟کیا تم سب نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ نہیں کیا تھا؟‘‘علی کی آواز بلند ہوئی۔

’’کیا تھا،لیکن علی میری بھی زندگی ہے۔جوان سب میں ڈسٹرب ہو کر رہ گئی ہے۔‘‘وہ پر سکون لہجے میں کہہ رہا تھا۔

’’میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم مجھے اس موقعے پر اکیلا چھوڑنے کی بات کروگے؟دو ہی پیشیاں ہوئی ہیں نوید!اور اگلی پیشی پر عاصم کو پھانسی ہو جائے گی۔تم اس وقت پیچھے ہٹنے کی بات کر رہے ہو؟‘‘علی نہ جانے اُسے کیوں سمجھا رہا تھا؟حالانکہ اُسکے چہرے پر لکھا تھا کہ وہ حتمی فیصلہ کرکے آیا ہے۔

’’اگلی پیشی؟تم واقعی اگلی پیشی پر کیس ختم کرنے والے ہو؟تمہیں تو اُنکی جڑوں تک پہنچنا ہے،اُنکی بنیادیں ہلانی ہیں۔تم کہاں عاصم کی پھانسی پر راضی ہو گے‘‘،تلخی سے کہتا نوید،اُسکے اوسان خطا کر رہا تھا۔

’’نہیں نوید!تم ایسا نہیں کر سکتے‘‘وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔’’کچھ اور بات ہے۔تم کچھ چھپا رہے ہو نہ مجھ سے؟مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟‘‘وہ جیسے کچھ سمجھتے ہوئے سر ہلا رہا تھا۔مقدّم جا چکا تھا اور اس کیس کا دوسرا اہم گواہ بھی جانے کی باتیں کر رہا تھا۔کچھ تو گڑ بڑ تھی۔

’’میں کیا چھپاؤں گا تم سے؟میرا کیریئر ہے،میری ایک فیملی ہے۔اور ہر کسی کا باپ تمہارے باپ کی طرح ساتھ دینے والا نہیں ہوتا۔‘‘وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔علی نرم پڑا۔

’’دیکھو!میں جانتا ہوں کہ تم لوگ اب بیزار ہو چکے ہو،اِسی لیے میں تم میں سے کسی نہیں کہہ رہا کہ وہ آگے بھی اس کیس سے زبردستی جڑا رہے۔وہ میں اور میرے ابّا دیکھ لیں گے۔لیکن کم از کم عاصم کو سزا ہونے تک تو ساتھ دو‘‘علی نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر ملتجی لہجے میں کہا۔نوید کا دل دکھا لیکن وہ مجبور تھا۔چاہ کر بھی اُسے بتا نہیں سکتا تھا کہ وہ کس تکلیف سے گزر رہا ہے۔وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔دوست کے ساتھ غدّاری صحیح لیکن وہ اپنے ماں باپ کی نظروں میں مزید نہیں گرنا چاہتا تھا۔اگر وہ ابھی کمزور پڑ گیا تو مزید کسی مشکل میں پڑ سکتا تھا۔اُسے آنے والے خطرے کے مقابلے میں علی کی ناراضگی قبول تھی۔

اُس نے اُسکے ہاتھ جھٹکیں،تو وہ حیران رہ گیا۔عمر اُسی وقت اندر داخل ہوا تھا۔اُسے نہیں معلوم یہاں کیا ہو رہا تھا لیکن اُس نے نوید کو علی کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے دیکھا تھا۔وہ ٹھٹک کر وہیں رکا۔

''علی ! بس بہت ہو گیا ہے۔ میں تمہیں بار بار سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن تم سمجھ نہیں رہے۔ میرے گھر والے ہیں، ایک چھوٹی بہن ہے۔ تمہیں سمجھ کیوں نہیں آ رہی یہ بات ؟ میں اُن سب کی زندگیاں نہیں برباد کر سکتا وہ بھی ایک مری ہوئی لڑکی کے لیے'' اُس نے کیسے صنوبر کو مری ہوئی لڑکی کہا تھا، یہ وہی جانتا تھا۔ علی نفی میں سر ہلاتا پلٹ گیا، کچھ قدم آگے بڑھ کر اُس نے پہلے اپنے چہرے پر بے دردی سے ہاتھ پھیرا، پھر دوبارہ نوید کی جانب پلٹا تو اُسکی آنکھوں میں غصّہ واضح تھا۔

''مجھے پہلے ہی تم میں سے کسی کی مدد نہیں لینی چاہیے تھی۔ جسے تم مری ہوئی لڑکی کہہ رہے ہو، وہ بھی کسی کی بیٹی تھی، بہنوں جیسی تھی میرے لیے، وہ بھی کبھی زندہ تھی۔ تم سب ایف آئی آر کٹوانے تک تو بخوشی میرے ساتھ تھے لیکن جب مقدمے کی بات آئی تو دو پیشیوں میں ہی تم لوگوں کی ہمت جواب دے گئی'' وہ غصّے میں سب کو ایک ہی ترازو میں ناپ رہا تھا۔ عمر اندر آ چکا تھا اور ناسمجھی سے اُن دونوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔

''مجھے پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا۔۔۔اُسی وقت سمجھ لینا چاہیے تھا جب مقدّم یہاں سے فرار ہوا تھا۔''اُس نے ٹھیک ٹھاک غصّے سے کہا تھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''اِس آواز پر اُن دونوں نے ہی رک کر دیکھا، عمر وہیں تھا۔ اُنہیں اُسکے آنے کی خبر نہ ہو سکی تھی۔

''اپنے ہی دوست کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال کس طرح کر سکتے ہو تم؟''عمر نے سختی سے کہا تھا۔ اب کہ رضا اور حسین بھی دروازے سے داخل ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

''دوست ؟'' وہ تلخی سے ہنسا۔ ''میں نے دیکھ لیں ساری دوستیاں۔ اب مجھے کوئی شک نہیں ہے کہ مقدّم اس کیس کے ڈر سے ہی یہاں سے فرار ہوا ہے''اُس کا سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ وہ غصّے میں اپنے الفاظ پر غور نہیں کرتا تھا۔

''اب اگر تم نے دوبارہ یہ لفظ استعمال کیا تو جان سے مار دوں گا تمہیں''اُسے گریبان سے پکڑتے ہوئے عمر حلق کے بل چیخا تھا۔ علی تو کیا، وہاں کھڑا ہر شخص اُسکے، اِس جارحانہ انداز پر، جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

''کیا ہی، کیا ہے تم نے مقدّم کے لیے؟ ایک بار بھی اُسے ڈھونڈھنے کی کوشش کی اب تک؟'' وہ چیخ رہا تھا۔

''گریبان چھوڑو میرا'' علی نے سرخ آنکھوں کے ساتھ اُسے دیکھا تھا۔

''کیا کر رہے ہو تم دونوں؟ پاگل ہو چکے ہو کیا؟'' حسین نے عمر کو اور نوید نے علی کو پکڑ کے پیچھے ہٹایا تھا۔

''کیا تمہیں احساس ہے کہ تمہارا دوست، اپنے خاندان سمیت پچھلے چار ماہ سے گمشدہ ہے؟ کیا تم نے سوچا کہ اُسکے ساتھ کیا ہوا؟'' حسین اُسے پیچھے دھکیل رہا تھا لیکن وہ اُسی طرح چلا رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کبھی عمر کا یہ روپ بھی دیکھنے کو ملے گا۔

''جتنا وقت تم نے اس مری ہوئی لڑکی کے لیے لگایا ہے، اتنا اپنے زندہ دوست کی تلاش میں لگایا ہوتا تو آج وہ ہمارے ساتھ ہوتا'' وہ علی کی آنکھوں میں دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

''خاموش ہو جاؤ عمر'' حسین اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اب اگر تم میں سے کسی نے بھی، اُسے مری ہوئی لڑکی کہا تو میں بھول جاؤں گا کہ تم لوگ میرے دوست ہو'' اب کہ علی بھی چیخا تھا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا، لیکن نوید نے اُسے روک رکھا تھا۔ اُسکا خون کھول رہا تھا۔

''یہ تمہیں مقدّم کو مفرور کہنے سے پہلے سوچنا تھا'' عمر آج جیسے رکنے والا نہیں تھا۔

''بس کرو تم دونوں، ہو کیا گیا ہے آخر؟'' رضا نے بلآخر اُن سب سے بھی زیادہ تیز آواز میں کہا تھا۔ اُنکی آوازیں اتنی بلند تو تھیں کہ یقیناً محلے والوں تک بھی باآسانی پہنچ رہی تھیں۔

''علی! بس بہت ہو چکا ہے۔ تم غصّے میں یہ بھی نہیں دیکھ رہے کہ کیا کہہ رہے ہو۔'' نوید نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے انگارے برساتی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

''تم نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے ناں!۔۔۔'' وہ رک کے اُسے دیکھنے لگا۔ ''پھر تمہارا کوئی کام نہیں یہاں۔ تم جا سکتے ہو'' اُس نے ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو نوید ساکت رہ گیا۔ وہ اُسے اپنے گھر سے نکلنے کو کہہ رہا تھا۔

تو بس اتنی ہی اوقات تھی اُسکی؟ ہمیشہ کی طرح جب وہ کسی کی امیدوں پر پورا نہیں اُتر سکے گا، تو اسے ایسے ہی ذلیل کیا جائیگا؟ اُسکے نصیب میں ہی اتنی تذلیل کیوں تھی؟ کیا وہ اتنا غیر اہم تھا؟ کیا کبھی کوئی اُسے سمجھنے کی کوشش بھی کریگا؟ اُسکا دل کر رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس

میں سما جائے۔ایسی تذلیل تو اُسکے باپ نے بھی اُسکی نہیں کی تھی۔اگلے ہی لمحے اُس نے لب بھینچتے ہوئے اپنی بائیک کی چابی میز سے اٹھائی اور کچھ بھی کہے بنا وہاں سے نکل گیا۔

''نوید۔۔۔''رضا نے پیچھے سے اُسے آواز دے کر روکنا چاہا پر وہ نہیں رکا تھا۔

''''تم کر کیا رہے ہو آخر؟ تم نے کھڑے کھڑے اپنے دوست کو گھر سے نکال دیا؟''حسین کا ضبط اب جواب دے گیا تھا۔

''میں نے ٹھیک کیا''وہ بلکل شرمندہ نہیں تھا۔

''صرف اپنی ضد کے آگے تم اپنے دوستوں کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہو؟افسوس ہے تم پر۔۔۔''عمر بس اتنا ہی کہہ سکا اور وہ بھی وہاں سے جانے کے لیے مڑ گیا۔

''ایک مظلوم انسان کو انصاف دلانا تم لوگوں کو میری ضد لگ رہا ہے؟''علی نے پیچھے سے اُسے جواب دیا لیکن عمر رکا نہیں بلکہ وہاں سے نکل گیا۔

''مجھے کسی کی بھی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔میں اکیلے ہی کر لوں گا جو ضروری ہوا''وہ میز کو ٹھوکر مارتا ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔اب وہاں بس حسین اور رضا ہی باقی رہ گئے تھے۔رضا ویسے ہی کافی عرصے بعد اُن سے ملنے آیا تھا۔علی کے جانے کے بعد اب اُنکا وہاں کوئی کام تو بچا نہ تھا،لہٰذا وہ بھی خاموشی سے وہاں سے چلے گئے۔

یہ اُنکی دوستی میں آنے والی پہلی اور سب سے گہری دراڑ تھی۔اسکے بعد تو دوستی اور وفاداری کی یہ عمارت بہت جلد زمین بوس ہونے والی تھی۔

--------+-------+------

اس جھگڑے کے بعد کسی نے بھی کسی سے بات نہ کی تھی،پورا ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔آخری پیشی جس میں عاصم کو پھانسی کی سزا سنائی جانی تھی،وہ بھی کسی وجہ سے موخر ہو گئی تھی۔نوید کی تو جیسے سانسیں ہی اس آخری پیشی کے ساتھ چل رہی تھیں۔راتوں کو نیند نہ آتی،آ جاتی تو خواب میں وہ خود کو صنوبر کے قاتل کے طور پر ہر جگہ بدنام ہوتے دیکھتا،تو کبھی دیکھتا کہ اُسکا باپ اُسے مارتے ہوئے گھر سے نکال رہا

ہے۔ وہ شدید اینزائٹی (اضطراب) کا شکار ہو رہا تھا۔ اب تک اس مقدمے میں اُسکے چشم دید گواہ ہونے پر، خلاف توقع اُسکے گھر والے خاموش رہے تھے۔ یا تو وہ اُسے اتنی سنجیدگی سے نہیں لے رہے تھے، یا پھر انہوں نے نوید کے معاملات میں بولنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن کب تک ؟ اگر بدنامی اُسکے حصے میں آتی تو کیا تب اُسکے گھر والے خاموش رہ سکے گے ؟

پچھلے ایک ہفتے سے وہ بار بار علی کے بارے میں سوچتا، اُسکا ملتجی لہجہ یاد آتا تو شرم سے زمین میں گڑنے لگتا۔ وہ کس مجبوری میں اپنے دوست کو اکیلا چھوڑ آیا تھا، صرف وہی جانتا تھا۔ پھر اُسکا نوید کو گھر سے نکالنا یاد آتا تو نئے سرے سے ڈپریشن کا شکار ہو جاتا۔ اس کشمکش نے اُسکے اعصاب بری طرح توڑ دیے تھے۔ وہ سلِپ پیرالائز کا شکار ہونے لگا تھا۔

کئی مرتبہ سوچتا کہ جا کر علی کو سب سچ بتا دے۔ لیکن نہیں بتا پاتا، وہ اپنے رازوں سے کسی کو آشنا نہیں ہونے دے سکتا تھا۔ لیکن کیا سچ میں ایسا ہی ہونا تھا؟

اِسی کشمکش میں کچھ دن اور سرکے، اُس روز وہ سی ایس ایس کا اسکریننگ ٹیسٹ دے کر گھر آیا تھا۔ جب اُسکے موبائل پر آنے والے میسج نے اُسکے حواس صحیح معنوں میں سلب کر دیئے تھے۔ یہ اُسکے اعصاب پر پڑنے والے تمام حملوں میں سب سے بھاری حملہ تھا۔

''عاصم کمال جیل میں مردہ پایا گیا تھا''

--------+-------+------

سانحے کے چھ ماہ بعد:

عاصم مر چکا تھا۔ اب میڈیا کی دلچسپی صنوبر کے بجائے عاصم کے قاتلوں پر چلی گئی تھی۔ پچھلے ایک ماہ میں اُسکے تمام پوسٹ مارٹم اور فرانزک رپورٹ اُسکی طبعی موت کی نشان دہی کر رہے تھے۔ سوتے میں اُسکا دل بند ہوا تھا۔ لیکن میڈیا کو سو فیصد یقین تھا کہ یہ قتل ہے۔ جو بات علی چاہتا تھا وہی ہو گئی تھی، اب میڈیا بھی چیخ چیخ کے کہہ رہا تھا کہ عاصم کے ساتھ کوئی اور بھی ملوث تھا۔ اور اُسی نے خود کو چھپانے کے لئے عاصم کو مارا ہے۔

نوید کو اب نیا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ آخری بار عاصم نے اُسی سے بات کی تھی۔ اگر اُسکی کال ٹریس کر لی گئی تو؟ اگر عاصم کے قتل میں اُسے ہی گرفتار کر لیا گیا تو؟ وہ نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا؟ دن بدن وہ نفسیاتی مریض بنتا جا رہا تھا۔

''اگر یہ سب ایسے ہی چلتا رہا تو کسی دن میرا دل بند ہو جائیگا''اُس نے سوچا اور پھر ایک فیصلہ کیا۔ وہ تھک چکا تھا ان سب حالات سے۔ اُسکا ذہن ہر بار اُسے ،اُس نہج پر لے جاتا تھا جو شاید کبھی بھی نہیں ہونے والا تھا،اور وہ اُس کبھی بھی نہ ہونے والے انجام کو سوچ سوچ کر ہلکان ہوئے جا رہا تھا۔ایسے میں یہی ٹھیک تھا کہ وہ علی کو سب بتا دے۔اپنے اور صنوبر کے بارے میں ،اُسکی اور عاصم کی آخری گفتگو کے بارے میں۔اُسے نہیں معلوم کہ اُسکے بعد کیا ہو گا؟ لیکن کم از کم وہ اس بوجھ سے تو آزاد ہو گا۔

اُس نے اُن سب کو میسیج کیا اور علی کے گھر آنے کو کہا۔ سب نے ہی مناسب جواب دیا خصوصاً عمر نے،وہ جیسے انتظار میں ہی بیٹھا تھا۔نوید نے بائیک کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

پیچھے اُسکے گھر والے،آنے والی عید پر بشریٰ کو دیا جانے والا تحفہ تیار کر رہے تھے۔ لیکن اُسے ان سب میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلآخر وہ لوگ ایک ماہ بعد اکھٹے ہونے جا رہے تھے۔

لیکن شاید آخری مرتبہ۔۔۔۔

--------+-------+------

''تم نے اچانک سے یہ کیسا فیصلہ کر لیا؟ مجھے نہیں یاد کہ تمہاری کبھی ایسی کوئی خواہش رہی تھی۔'' وہ لوگ اِس وقت علی کے گھر کے ڈرائنگ روم میں تھے۔ حسین، عمر سے سوال کر رہا تھا۔ علی بے تاثر سے چہرے کے ساتھ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''میری ہمیشہ سے ہی یہی خواہش تھی لیکن میں نے کبھی تمہیں بتایا نہیں، کیونکہ مجھے خود کنفرم نہیں تھا، کہ ایسا کب تک ہو گا؟ لیکن کیونکہ اب ایسا ہو چکا ہے تو میں نے سوچا تم لوگوں کو بتا دوں'' اُس نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔

''کب جا رہے ہو؟''نوید نے پوچھا۔

''کل۔۔۔''

''کل جا رہے ہو اور ہمیں اب بتانے آئے ہو؟''حسین نے شکوہ کیا۔

''پہلے بتادیا ہوتا تو تم لوگ سمجھتے کہ مقدّم کی طرح میں بھی فرار ہو رہا ہوں'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوا۔ علی نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کے اُسے دیکھا اور دوبارہ رخ میز کی جانب کر دیا۔

''تو کب تک واپس آؤ گے؟'' اُس نے پوچھا۔

''معلوم نہیں، میرا کنٹریکٹ پانچ چھے سالوں پر محیط ہے۔ اور میرا واپس آنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔ مجھے ویسے بھی اپنا مستقبل اس ملک میں نہیں بنانا'' اُس نے کہا۔ حسین نے اُسے غور سے دیکھا۔ ملک سے باہر جانے کا منصوبہ ایک دن میں نہیں بن جاتا۔ کچھ مسئلہ تھا اُسکے ساتھ، وہ کچھ چھپا رہا تھا۔ اُسکی آنکھوں کے نیچے گہرے ہلکے پڑے تھے۔ وزن بھی کافی گھٹ گیا تھا۔

''حیرت ہے، تم نے کبھی کہا نہیں کہ تم اپنا مستقبل باہر کے ملک میں بنانا چاہتے ہو؟'' اُسے، اُسکا ایسے اچانک جانا ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ خیر ہضم تو یہ بات کسی کو بھی نہیں ہو رہی تھی لیکن وہ لوگ خاموش تھے۔ حسین کو احساس ہوا کہ وہ اکیلا ہی بول رہا ہے۔ آخری بار جو دراڑ اُنکے درمیان آئی تھی وہ اُسے بھر نہیں پا رہے تھے۔ اب کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ نوید اضطراب کا شکار لگ رہا تھا، علی کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی چھائی تھی اور رضا کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا، وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

''آج کل ہر شے حیرت انگیز ہی ہو رہی ہے'' علی نے اتنی دیر میں پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ اور یہ واضح طنز کس پر تھا؟ کوئی سمجھ نہ سکا۔ عمر نے کوئی جواب نہ دیا۔ کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر بلآخر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میں چلتا ہوں اب، پیکنگ بھی رہتی ہیں کچھ، اور رات کی ہی فلائٹ ہے۔'' اُس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو باقی سب بھی خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔

''کہا سنا معاف کرنا'' اُس نے آگے بڑھ کے رسمی انداز میں رضا اور حسین کو باری باری گلے لگایا اور پھر نوید کو بھی، اُسکے بعد وہ علی کی طرف بڑھا۔

''میں غصّے میں زیادہ کچھ کہہ گیا تھا، معاف کر دینا مجھے۔۔۔'' شرمندگی سے کہتے ہوئے وہ، علی کو گلے لگانے آگے ہی بڑھا تھا کہ اُس نے اُسکا دایاں ہاتھ پکڑ کر اُس سے مصافحہ کیا۔ اور عمر۔۔۔ وہ وہیں رک گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اُس سے گلے بھی نہیں ملنا چاہتا تھا۔

''خیریت سے جاؤ'' اُس نے بس سنجیدگی سے اتنا ہی کہا تھا۔

''خدا حافظ۔۔۔'' سر ہلاتے ہوئے کہا اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ مقدم جا چکا تھا اور وہ جا رہا تھا۔ ساتھ گزارے دوستی کے لمحات اب یاد بننے جا رہے تھے، دوستی اب ختم ہونے جا رہی تھی، وہ چھے، ساڑھے چھے سال اب قصّہ ماضی بننے جا رہے تھے۔ وہ بالآخر الگ ہو رہے تھے۔ رضا اور حسین، عمر کو باہر تک چھوڑنے ساتھ گئے تھے۔

''تمہیں کچھ کہنا ہے؟'' اُنکے جانے کے بعد علی نے اچانک ہی نوید سے پوچھا تھا۔

''ہاں!'' وہ ویسے بھی بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔

''کیا وضاحت دینا چاہتے ہو؟'' وہ آج بے حد سنجیدہ تھا۔ اُسکی یہ سنجیدگی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔

''علی! میں تمہیں اس طرح اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا لیکن۔۔۔'' وہ رکا، جیسے الفاظ ترتیب دے رہا ہو۔ اپنا آپ کھول کر کسی کے سامنے رکھنا آسان نہیں ہوتا۔

''لیکن؟'' علی نے اُسے بولنے پر اکسایا۔

''لیکن میں مجبور ہو گیا تھا۔'' وہ بے بسی سے بولا تھا۔

''کیا مجبوری تھی تمہاری؟'' اُس نے اگلا سوال کیا۔

''تم اس طرح کیوں بات کر رہے ہو مجھ سے؟'' نوید اُسکے انداز پر ٹھنکا تھا۔

''کس طرح بات کروں اب تم سے؟ میں بہت اچھے سے جانتا ہوں کہ اب تم کیا کہنے والے ہو؟ اپنی خود غرضی اور مفاد پرستی کو مجبوری کا نام مت دو'' جتنے تلخ لہجے میں وہ بولا تھا، نوید حیران رہ گیا تھا۔

''تم اس کیس سے صرف اسی لیے پیچھے ہٹے ہو کہ کہیں دنیا کو پتہ نہ چل جائے کہ تمہارا صنوبر سے کیا تعلق تھا؟'' اُسکے سر پر کسی نے پہاڑ لا کر گرا دیا تھا۔ یہ اُسکے کانوں نے کیا سنا تھا؟ یہ ابھی ابھی علی نے کیا کہا تھا؟ اُسے لگا اُسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔

''کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''اور کتنا بیو قوف بناؤ گے مجھے ؟ کس قسم کے انسان ہو یار تم؟ جس لڑکی کے لیے اتنے جذبات رکھے تھے دل میں، آج ضرورت پڑنے پر اُسی سے منہ موڑ لیا؟ کہ کہیں تم بدنام نہ ہو جاؤ۔ تمہارا نام ان سب میں نہ شامل ہو جائے'' وہ غصّے سے ایسے پھنکار رہا تھا، جیسے آج اِسی مقصد کے لیے یہاں بیٹھا ہو۔

''تم کیا بکواس کر رہے ہو؟''نوید جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''بکواس نہیں سچ ہے یہ''علی بھی کھڑا ہوا۔

''اب تم دونوں کو کیا ہوا ہے؟'' وہاں داخل ہوتے حسین نے بیزاری سے پوچھا تھا۔ رضا ساتھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''علی! ہم کسی اور وقت یہ بات کریں گے۔ ابھی تم غصّے میں ہو اور کچھ بھی بولتے جا رہے ہو''نوید نے حسین کو وہاں دیکھ کر بات ختم کرنی چاہی تھی۔

''نہیں نوید! یہ بات آج ہی ہو گی۔ اس کیس سے پیچھے ہٹنے میں تمہاری مجبوری نہیں خود غرضی ہے۔ تم کسی کے نہیں ہو سکتے، تم صرف اپنے آپ کے ہو۔ شکر ہے کہ صنوبر زندہ نہیں ہے۔ ورنہ تم تو بیچ راستے میں اُسے چھوڑ کر بھاگ سکتے تھے''

''علی!'' حسین جیسے ہوش میں آیا تھا۔ ''خاموش رہو! یہ کوئی کرنے کی بات ہے اس وقت؟''اُس نے علی کو ڈانٹتے ہوئے آنکھیں دکھائی تھی۔ نوید نے جھٹکے سے پلٹ کر پھٹی پھٹی نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

اُسکے لہجے میں تو حیرت ہونی چاہیے تھی ناں؟ پر وہاں تنبیہہ تھی، حیرت کا تو شائبہ تک نہ تھا۔ تو کیا وہ بھی جانتا تھا؟ اُس لمحے نوید پر ادراک ہوا کہ جو بات وہ خود سے بھی چھپائے پھر رہا تھا، اُسکا اشتہار تو پہلے ہی ساری دنیا میں لگا ہوا تھا۔ ایک وہ ہی بیو قوف تھا۔ انکشاف کا یہ مرحلہ اُس پر بھی شاق گزر رہا تھا۔

''یہی کرنے کی بات ہے حسین! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص اتنا گر سکتا ہے صرف اپنی ذات کے لئے۔''

''حد میں رہو علی! بہت بکواس کر لی ہے تم نے۔۔۔''نوید کی آواز بلند ہوئی تھی۔

''مجھے میری حد بہت اچھے سے معلوم ہے۔ حدود تو تم نے پار کی ہیں اپنی۔اور سچ تو یہ ہے کہ وہ لڑکی تمہارے لیے کبھی اہم تھی ہی نہیں، تم بس وقت گزار رہے تھے اُسکے ساتھ۔۔۔''علی کے الفاظ سلگتی سیخ کی مانند اُسکے دل میں پیوست ہوئے تھے۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے''حلق کے بل چیختے نوید کا ہاتھ بلند ہوا تھا اور علی کے چہرے پر زناٹے کے ساتھ پڑا تھا۔وہ لڑکھڑا کے پیچھے کی جانب ہوا تھا۔ حسین تو جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو کی مانند وہاں کھڑا تھا۔اُسکا دماغ ابھی ابھی دیکھے گئے منظر کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔

''تم میری کردار کشی کر رہے ہو؟ ہاں؟''نوید نے اُسکا گریبان پکڑ کے اُسے اپنے سامنے کھڑا کیا تھا۔

''تمہارا کردار کتنا ہے، میں بہت اچھے سے جان چکا ہوں۔ لہٰذا یہ دوغلا پن میرے سامنے تو مت ہی کرو''نوید اُس سے لمبا تھا، لیکن اِسکے باوجود علی نے اُسے پوری قوت سے دھکّا دیا تھا، جبکہ اُسکے الفاظ نوید پر کسی کاری ضرب کی طرح پڑ رہے تھے۔

''بس کر دو خدا کے واسطے۔۔۔بس کر دو''اِس سے پہلے کے نوید کچھ کرتا، حسین دونوں کے بیچ میں آیا تھا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے علی؟ کیوں کر رہے ہو ایسے؟''حسین نے اُسے تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

''مجھے کیا ہو گیا ہے؟ مجھے؟''وہ حیران نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''تم لوگوں نے بیچ راستے میں مجھے چھوڑا ہے۔پہلے مقدّم، پھر نوید اور آج عمر بھی۔۔۔''علی کی آواز میں دکھ تھا۔

''کبھی جاننے کی کوشش بھی کی ہے کہ تمہارے دوست کیوں گئے؟ مقدّم کیوں غائب ہوا؟ عمر کیوں بنا بتائے چلا گیا؟ کبھی اپنی ضد اور جنون سے باہر آکر اپنے دوستوں کو بھی جاننے کی کوشش کی ہے؟''نوید نے دھاڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

''دیکھو علی! سب کی اپنی مرضی ہے، اگر کوئی تمہارا ساتھ دینا نہیں چاہتا تو تم زبردستی نہیں کر سکتے۔ لیکن میں آخری وقت تک تمہارے ساتھ ہوں۔اور اگر رضا اس کیس کا حصّہ ہوتا تو وہ بھی آخر تک تمہارا ساتھ دیتا''حسین اُسے رسانیت سے سمجھا رہا تھا۔

''رضا؟ ہونہہ۔۔۔''وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔

''رضا پہلے خود کو تو سنبھال لے، جو اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا وہ کسی اور کے لیے کیا کریگا؟''وہ تلخ لہجے میں بولا تھا۔ حسین تو اُسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

''تم پاگل ہو چکے ہو علی! یہ کیس تمہارے حواسوں پر سوار ہو چکا ہے۔ ہم جتنا تمہارا ساتھ دے سکتے تھے ہم نے دیا، لیکن تم ہم سب کے بارے میں اس طرح سوچتے ہو گے، میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا'' حسین نفی میں سر ہلاتے صدمے سی کیفیت میں کہتا پیچھے ہٹ رہا تھا۔

''میں ایسا نہیں سوچتا، اور نہ میں نے ایسا کبھی سوچا تھا۔ لیکن تم لوگوں کے رویّوں نے مجھے ایسا سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ مقدّم غائب ہوا۔ ٹھیک ہے، مان لیا اُسکے غائب ہونے کا کیس سے تعلق نہیں ہو گا۔ لیکن عمر؟ آج کے دن سے پہلے تک تو کبھی اُس نے ذکر بھی نہیں کیا تھا کہ وہ ملک چھوڑنا چاہتا ہے۔ کیوں گیا وہ آخر؟'' علی سوال کر رہا تھا۔ اپنے دوستوں کا عین راستے میں چھوڑ جانا، اُسکا دل ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا۔

''کیوں؟ کیا ہم سب تمہیں جواب دہ ہیں؟ کیا ہماری زندگیاں نہیں ہیں؟ یا تم نے خرید لیا ہے ہمیں؟'' اس آواز پر تینوں نے گردنیں گھما کر دیکھا تھا۔ رضا دروازے پر کھڑا تھا اور آہستہ آہستہ چلتے علی کی جانب آ رہا تھا۔

''ہر شخص کو حق ہے اپنی زندگی کے فیصلے لینے کا، کیا ہم تمہارے پابند ہیں کہ تمہاری مرضی اور تمہاری اجازت کے بنا اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ نہیں لے سکتے؟'' رضا اُسکے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔

''کیا کر رہے ہو تم یہ؟ میں پہلے ہی ان دونوں کو اتنی مشکلوں سے سمجھا رہا ہوں۔ اب تم کیوں شروع ہو گئے ہو؟'' حسین کو لگ رہا تھا کہ وہ کسی پاگل خانے میں آ گیا ہے، جہاں ہر کسی کو ایک دوسرے سے لڑنے کا بہانہ درکار تھا۔

''میں پچھلے کئی مہینوں سے دیکھ رہا ہوں کہ کس طرح اس نے سب کی زندگیاں تباہ کر کے رکھ دی ہیں'' انگلی سے علی کی طرف اشارہ کرتے اُس نے حسین کو جواب دیا تھا۔ اور علی تو جیسے پتھر کا بت بنا کھڑا تھا۔

''ہر کسی سے جواب طلب کر رہے ہو نہ تم؟ چلو اب تم بتاؤ۔ کیوں اہم ہے وہ لڑکی تمہارے لیے اتنا؟'' رضا نے سینے پر بازو باندھتے سکون سے اُس سے پوچھا تھا۔

''وہ میرے ڈرائیور کی بیٹی۔۔۔'' علی لب بھینچے جواب دینے ہی لگا تھا کہ رضا نے اُسکی بات کاٹی۔

''ڈرائیور کی بیٹی؟ واقعی؟'' اُس نے طنزیہ انداز میں بھنویں اچکائی تھیں۔

''صرف ڈرائیور کی بیٹی کے لیے کوئی اتنا نہیں کرتا کہ دوستی، انسانیت اور اخلاق سب کچھ بھلا دے۔ تم ہی بتاؤ کہ آخر اور کیا تعلق ہے تمہارا اُس سے؟ جس تعلق کی قیمت تم ہم سے مانگ رہے ہو'' زہر میں ڈوبے رضا کے الفاظ صرف علی کو ہی نہیں بلکہ نوید کو بھی چھلنی کر گئے تھے۔ جس لڑکی کو اس نے گھر میں بسانے کے خواب دیکھے تھے، جسے زندگی میں لانے کی خواہش کی تھی، اُس لڑکی کا ذکر وہ لوگ کس عامیانہ طریقے سے کر رہے تھے؟

''اپنی اوقات میں رہو رضا!'' خونخوار لہجے میں کہتے علی نے اُسے جیسے دھمکی دی تھی۔

''میں اپنی اوقات میں ہی ہوں۔ تمہیں کیا لگ رہا ہے یہ صرف میرے الفاظ ہیں؟ ہم میں سے ہر شخص جاننا چاہتا ہے کہ تمہارے لیے آخر وہ اتنی اہم کیوں تھی؟ لیکن شاید باقی سب میں اتنی اخلاقیات تو تھیں کہ بنا تم سے کوئی سوال کیے ہی چلے گئے۔ لیکن تم ہم سب کو کٹہرے میں کھڑا کر رہے ہو۔'' رضا یہ کیا کہہ رہا تھا؟ وہ اسے اُسکی اپنی ہی نظروں میں بری طرح گرا رہا تھا۔

''خاموش ہو جاؤ رضا۔۔۔ خاموش ہو جاؤ'' بلآخر نوید پھٹ پڑا تھا۔

''تم ایک مری ہوئی، بے دردی سے قتل ہوئی لڑکی کے لیے یہ الفاظ استعمال کر رہے ہو۔ کچھ تو خیال کرو وہ بھی کسی کی بیٹی ہی تھی'' نوید نے جیسے التجا کی تھی۔

''اوہ۔۔۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ یہاں ایک نہیں دو دو شکار ہیں۔'' رضا نے تو آج انتہا کر دی تھی۔ نوید تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج ہی کے دن میں وہ اس طرح ذلیل ہو گا۔ صرف حسین ہی نہیں رضا بھی یہ بات جانتا تھا۔ تو ایک وہ ہی گدھا تھا؟ ''تم دونوں ایک کام کیوں نہیں کرتے؟ اپنے آپس کے مسئلے خود حل کرو اور بخش دو ہم سب کو'' وہ ہاتھ جوڑ کے کہتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا، حسین اُسکے پیچھے دوڑا تھا۔ کمرے میں ایک بار پھر علی اور نوید باقی رہ گئے تھے۔ علی کے ماں باپ گھر پے نہیں تھے۔ اور فاطمہ اپنے کمرے میں تھی۔ نامعلوم اُس نے بھی یہ آوازیں سنی تھی یا نہیں؟

''میں نے اُسکے لیے تب بھی آواز اٹھائی تھی، جب میں جانتا بھی نہ تھا کہ اُس رات اغوا ہونے والی لڑکی صنوبر ہے'' علی کو لگا کہ وہ رو دے گا۔ اپنے دوستوں کا یہ سلوک اور خصوصاً رضا کا لگایا گیا، الزام اُسکے لیے ناقابل برداشت تھا۔ نہ جانے کیوں اُس نے نوید کو وضاحت دی

تھی؟ نوید چند لمحے اُسے دیکھتا رہا اور پھر خاموشی سے وہاں سے چلا گیا تھا۔ علی تھک کے وہیں صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ اُسکے گال پر نوید کے مارے گئے تھپڑ کا نشان واضح تھا۔ فاطمہ وہاں آکر اُسکے برابر بیٹھی تھی۔

''علی! کیا ہوا ہے یہاں؟ مجھے کچھ بتاؤ پلیز۔۔۔'' وہ اُسکا بازو تھامے پریشانی سے کہہ رہی تھی۔ اُنکی آوازیں اُس نے بھی سنی تھی۔ وہ خوفزدہ تھی۔

نہ حسین اندر واپس آیا، نہ رضا اور نہ ہی نوید۔ اُس رات علی کو اُسکے دوستوں نے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔۔۔

--------+-------+------

''رضا!۔۔۔رکو رضا!'' علی کے گھر سے نکلنے کے بعد حسین اُسکے پیچھے آیا تھا۔ وہ اُسے دیکھ کر رکا۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم ہاں؟ اور کیوں؟'' حسین اُسکے پاس آکر رکا اور اُسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا کیا ہے میں نے؟'' اُس نے بے نیازی سے کہا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''یہ جو اندر تم کر کے آئے ہو؟ تمہیں کیا لگتا ہے مجھے سمجھ نہیں آیا؟ تم تو جیسے لڑنے کا موقع ڈھونڈ رہے تھے۔ اور آج یہ موقع تمہیں مل گیا تو تم نے اُسے غنیمت جانتے ہوئے، اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ہاں؟'' اُس نے ایک لمحے کے لیے رضا کو حیران کر دیا تھا۔ وہ اُسے اُسکی سوچ سے بھی زیادہ جانتا تھا۔ اگلے ہی لمحے رضا نے خود کو کمپوز کیا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے، میں نے وہ کیا جو ضروری تھا۔''

''کیوں کیا تم نے ایسا آخر؟'' حسین نے اُسکا بازو پکڑ کے اُسے جھنجھوڑا تھا۔

''کیوں تم ہم سب سے لاتعلق ہونے کا بہانہ تلاش کر رہے تھے؟ اور آج تم نے اپنا مقصد حاصل کر ہی لیا۔ کیوں رضا؟ کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ ایسا؟ کم از کم مجھے تو بتاؤ یار! میں تمہارا بھائی ہوں'' حسین کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ رضا نے اپنے بازو سے اُسکا ہاتھ ہٹایا اور سرد لہجے میں بولا۔

''میرا کوئی نہیں ہے، اور مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے'' وہ اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال بے تاثر لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔ سمجھ گیا'' حسین سر ہلاتے پیچھے ہوا۔ آج وہ ہمیشہ کی طرح اُس پر دھونس نہیں جما سکا تھا۔ ''سمجھ گیا میں! میں آج سے اُس وقت تک تم میں سے کسی سے بھی نہیں ملوں گا، جب تک کہ تم لوگوں کی عقلیں ٹھکانے نہیں آجاتیں'' وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹتا، مڑتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔ یہ اُنکی دوستی کی آخری رات تھی۔

اگر حسین ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تو اُسے نظر آتا، رضا آنکھوں میں ڈھیروں آنسوں لیے اُسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ اُس نے آج ایسا کیوں کیا تھا؟ صرف وہی جانتا تھا۔ صرف وہی۔۔۔

--------+-------+------

آخری پیشی

اُس رات کے بعد نوید کسی رات سکون سے نہ سو سکا، ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ اب میڈیا پر اُسکا نام آئے گا، اب اچانک ہی پولیس کو پتہ چلے گا کہ عاصم نے آخری بار اُس سے بات کی تھی یا اب معلوم ہو گا کہ صنوبر سے اُسکا بھی کوئی تعلق تھا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ آخری پیشی والے دن اُن میں سے کوئی نہیں آیا تھا علی کا ساتھ دینے، سوائے حسین کے۔۔۔

اُس نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ وہ وہاں آیا بھی تھا اور جج سے مطالبہ بھی کیا تھا کہ اُس دوسرے شخص کو تلاش کیا جائے، جو اُس رات عاصم کے ساتھ تھا۔ لیکن گواہ مضبوط نہ ہونے اور ثبوت ناکافی ہونے کی وجہ سے عدالت نے یہ کیس تاحیات بند کر دیا تھا۔ علی کو معلوم تھا کہ ایسا ہی ہونا ہے۔ وہ حسین سے ملے بنا وہاں سے نکل گیا تھا۔

نیوز چینل پر ہر جگہ کیس بند ہونے کی خبر آرہی تھی۔ نوید کو ایک اطمینان سا محسوس ہوا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اپنی اس خود غرضی پر اُسے شرمندگی نے آگھیرا تھا۔ کئی مرتبہ سوچتا کہ جا کر علی سے ملے لیکن پھر اُسکے وہ الزامات یاد آتے جو اُس نے اس پر لگائے تھے۔ اُس رات کے بعد زندگی ایک ہی ڈگر پر چلنے لگی تھی لیکن پھر بھی، کچھ بھی نارمل نہیں رہا تھا۔ وہ دوستوں سے ملنا، ساتھ بیٹھنے کے منصوبے بنانا، پھر سب کو اکھٹے کرنا۔ سب کہیں کھو گیا تھا۔ مقدّم واپس نہیں آیا، عمر نے پلٹ کر کوئی رابطہ نہ کیا۔ حالانکہ وہ باہر جا کر اُن سے رابطہ رکھ سکتا تھا لیکن اُس نے ایسی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ علی سے تو شاید وہ اب مر کے بھی بات نہ کرتا۔۔۔ زندگی یکدم سے بہت خالی سی ہو گئی تھی۔

اُس رات کے بعد حسین نے رضا سے ملنے کی کوشش کی تو اس پر ایک نیا انکشاف ہوا تھا۔ رضا آخری بار جھگڑے والی رات ہی اپنے گھر سے نکلا تھا لیکن واپس نہیں آیا۔ اُسکے ماموں نے بتایا کہ وہ اپنے باپ کے پاس کینیڈا چلا گیا ہے۔ اگر حسین کے سامنے اُس نے اپنا آپ کھول کے نہ رکھا ہوتا، تو وہ شاید آسانی سے اس بات پر یقین کر لیتا لیکن وہ جانتا تھا کہ اُسے اپنے باپ سے کتنی نفرت تھی۔

ان سب کے باوجود بھی وہ رضا کو تلاش نہ کر سکا تھا۔ وہ رات اُنکی دوستی کے ساتھ ساتھ کئی راز لیکر فنا ہو گئی تھی۔

اور آج دس سالوں بعد ایک انجان قاتل نے اُنہیں پھر سے ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

ایک قتل۔۔۔

جس نے اُنہیں جدا کیا تھا۔

اور ایک قتل۔۔۔

جس نے اُنہیں پھر سے اکھٹا کیا تھا۔

قسمت اب کیا چاہتی تھی؟

--------+-------+------

موجودہ رات میں:

گھر خاموش تھا، اُسکا بیٹا احمد اور سفیر صاحب سو چکے تھے۔ لیکن نیند اُسکی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اپنے کمرے کی بالکنی میں آکر اُس نے ایک نظر سنسان پڑی سڑک کو دیکھا۔ آس پاس کچھ بھی مشکوک نظر نہ آیا، لیکن دل پھر بھی بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کوئی اُسکے قتل کا منصوبہ بنا رہا تھا، وہ بھی نہ جانے کب سے؟ یہ کوئی مذاق نہیں تھا۔

علی نے بالکنی کی طرف کھلتے دروازے کو اچھی طرح بند کیا اور اُسے لاک کر کے پوری تسلی کی۔ دروازہ شیشے کا تھا۔ اگر کسی نے اِسے توڑنے کی کوشش کی تو؟ دل میں ایک بے تکا سا خیال کوندا، وہ مزید خوفزدہ ہوا۔ پھر اُس نے باری باری گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں اچھے سے بند کیں۔

''مجھے گھر میں سی سی ٹی وی کی تعداد میں اضافہ کرنا ہوگا،اور دروازے پر مسلح چوکیدار بھی رکھنا چاہیے'' وہ دل ہی دل میں خود کو مطمئن کرنا چاہتا تھا پر کر نہیں پا رہا تھا۔

آج خوف کی پہلی رات تھی،اور خوف کی پہلی رات ہمیشہ ایسی ہی گزرتی ہے۔

--------+-------+------

''گھر کے آس پاس کسی بھی قسم کا کوئی بھی مشکوک انسان نظر آئے تو مجھے فوری اطلاع دینا،اور کوشش کرنا کی ہر گزرنے والے شخص پر نظر رکھو'' لان میں کھڑا مقدّم اپنے تینوں چوکیداروں کو سمجھا رہا تھا۔آج اُسکے چہرے پر پریشانی کے آثار واضح نظر آرہے تھے۔شدید ٹھنڈ کے باوجود بھی ماتھے پر آتے پسینے کے قطروں کو بار بار پونچھتا وہ شدید مضطرب تھا۔

''صاحب! سب خیریت ہے ناں؟'' ایک چوکیدار نے پوچھا۔

''کیا اسے بتانا چاہیے؟'' اُس نے سوچا۔حالانکہ گارڈ پرانا اور بھروسے کا تھا لیکن آج ملنے والی خبر نے،اُسکا اپنے سائے پر سے بھی بھروسہ اٹھا دیا تھا۔

''مسئلہ کوئی نہیں ہے۔مجھے معلوم ہوا ہے کہ پچھلے دنوں ساتھ والی گلی میں ڈکیتی کا واقعہ ہوا ہے۔تو میں احتیاطی تدابیر کرنا چاہتا ہوں بس۔'' اُس نے جواب دیا۔

''اب تم لوگ جا سکتے ہو'' تینوں سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔اُس نے چہرہ گھما کر گھر کا جائزہ لیا۔دیواریں بہت اونچی نہیں تھیں،کوئی بھی باآسانی پھلانگ سکتا تھا۔

''دیواروں پر بجلی چھوڑنے والے جنگلے لگوانے ہونگے'' اُس نے دل میں سوچا۔آج سے پہلے ایسی ضرورت پیش نہیں آئی تھی،پر آج کے بعد کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

''آخر کون مارنا چاہتا ہے مجھے؟اور کیوں؟اور مارنے والا ہے کون؟ بھلا اُس نے مجھے مارنے کے لیے کس قسم کا منصوبہ بنایا ہوگا؟ کیا وہ مجھے گولی مار کر قتل کرنا چاہتا ہے؟ یا نیند میں گلا دبا کر؟ یا کچھ اور؟'' وہ نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا؟اُسے احساس ہوا کہ اُسکے پاؤں کانپ رہے

ہیں۔ یہ سب اتنا آسان نہیں تھا، ایک شخص سے اُسکی جان کا تحفظ چھین لیا جائے، تو اُسکے لیے دنیا کی ہر شے بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اُسکا سیکریٹری اُسے اگلے دن ہونے والی میٹنگ کی تفصیلات بھیج رہا تھا۔ پر اُسکا دل ہر شے سے اچاٹ ہو چکا تھا۔

پتہ نہیں اب کیا ہونے والا تھا؟

--------+-------+------

اپنے گھر کے کچن میں کھڑا عمر فریج میں منہ دیے کھڑا تھا۔ شاید وہ کھانا کھا کر اُسے ڈبوں میں بند کر کے فریج میں رکھ رہا تھا۔ تب ہی اچانک اُسے اپنے کمرے سے کوئی آواز آتی سنائی دی۔ وہ رکا، پھر سیدھا ہو کر فریج بند کیا۔

''یہ کیسی آواز تھی؟'' دل میں سوچا۔ کافی دیر کھڑا سوچتا رہا پر آواز دوبارہ نہ آئی۔

''وہم ہو گا میرا'' خود کو تسلی دی۔ پھر لاؤنج میں رکھی کرسی پر آبیٹھا۔ پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موندی تو مقدّم کی شکوہ کرتی آنکھیں یاد آئیں۔ دل اُداسی سے بھر گیا۔ وہ پچھلے ماہ علی کے ساتھ اُسکے آفس گیا تھا۔ تب نہیں جانتا تھا کہ سامنا مقدّم سے ہو گا۔

''پتہ نہیں، اُسے یہ بات معلوم بھی ہے کہ نہیں؟'' اُس نے سوچا۔ اُس روز مقدّم نے اُنہیں واقعی نہیں پہچانا تھا۔

اور آج ایف آئے اے کے دفتر جاتے ہوئے اُسے اندازہ نہیں تھا کہ رضا اور نوید سے بھی سامنا ہو جائیگا۔

''کتنا بدل گئے ہیں سب؟'' ساتھ گزارے ماضی کے کچھ گمشدہ لمحے، مُبہم سے انداز میں ذہن میں گھومنے لگے۔ وہ اسی طرح سر ٹکائے بیٹھا رہتا اگر جو چھناکے کے ساتھ شیشہ ٹوٹنے کی آواز نہ آتی۔ آواز اوپر والے کمرے سے آئی تھی۔ وہ الرٹ ہوتا سیدھا ہو بیٹھا۔

''کون ہے اوپر؟'' اُس نے خود سے سوال کیا۔

''وہ قاتل؟'' ذہن نے جواب دیا۔ اُسکا دل زور سے دھڑکا۔ اگلے ہی لمحے وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور پاس رکھا بھاری مجسمہ ہاتھوں میں اٹھالیا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے کمرے کے دروازے کے باہر آرکا، اُس نے یہاں وہاں دیکھا پر کوئی نہ تھا۔

''کیا مجھے اندر جانا چاہیے؟ یا کسی کو بتانا چاہیے؟'' اُس نے سوچا۔

''لیکن اگر اندر کوئی نہ ہوا؟ اور یہ صرف میرا وہم ہوا تو؟'' اُس نے تھوک نگلتے ہوئے دروازے پر ہاتھ رکھا اور اگلے ہی لمحے اُسے جھٹکے سے کھولتا اندر داخل ہو گیا۔ کمرہ خالی تھا، لیکن شیشے کا شوکیس نیچے گر کر چور چور ہو چکا تھا۔ کمرے کی سڑک کی جانب کھلتی کھڑکی بھی کھلی تھی۔ وہ اسی طرح آہستہ سے قدم بڑھاتے باتھ رُوم تک گیا اور اُسے بھی کھول کر دیکھا، پر وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ ابھی وہ باتھ رُوم کے دروازے پر ہی تھا کہ اُسے کسی سرسراہٹ کا احساس ہوا۔ جیسے کوئی کچھ گھسیٹ رہا ہو۔ اُسکا دل اُچھل کر حلق میں آیا۔ سہم کر پیچھے دیکھا، اگلے ہی لمحے اُسکی جان میں جان آئی تھی۔ وہ ایک بلی تھی، جو پیروں میں کوئی تھیلا گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ شوکیس بھی اُسی نے گرایا تھا، اور وہ یقیناً کھلی کھڑکی سے اندر آئی تھی۔ اُس نے سکون کا سانس خارج کیا۔ پھر بلی کو گود میں اٹھاتے ہوئے کھڑکی کو سختی سے بند کیا۔ اور کمرے سے باہر آ گیا۔

باہر آ کر ایک پیالے میں تھوڑا سا دودھ نکالا، اور مرکزی دروازے کے باہر رکھتے ہوئے بلی کو وہیں چھوڑ دیا۔ پھر دروازے کو بھی اچھی طرح بند کرتے ہوئے اندر آیا۔ آیت الکرسی اور دیگر سورتیں پڑھ کر گھر کے ہر کونے میں اچھی طرح دم کیا پھر واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

اُسکا دل ابھی بھی بے قابو ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سے خوف نے اُسکے پورے وجود کا احاطہ کر لیا تھا۔

یہ صورتحال اُسکی زندگی میں آنے والی تمام مشکلات میں سب سے زیادہ اعصاب شکن ثابت ہو رہی تھی۔

--------+-------+------

وہ اپنے ذاتی آفس میں کرسی کی پشت سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ کل جو کچھ ہوا تھا، اُسے قبول کرنے میں اُسے پوری رات لگ گئی تھی۔ اور اب صبح سے سر بھاری ہو رہا تھا۔ کسی نے اُسکے آفس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''آ جاؤ۔۔۔'' اُس نے کرسی سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ دروازہ کھول کر عمر اندر داخل ہوا تھا۔ علی حیران ہوا۔ وہ کم ہی اُسکے آفس آتا تھا۔ زیادہ تر وہ دونوں ایک دوسرے سے ملاقات، اُس کمرے میں کرتے تھے جو اُنکا اسٹوڈیو اور مشترکہ آفس تھا۔ وہ خاموشی سے اُسکے سامنے والی کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔ دونوں کے درمیان اب میز حائل تھی۔ عمر میز پر کوئی فائل رکھے اُسکے صفحات آگے پیچھے کر رہا تھا۔

''یہ دیکھو! ہمارا جنرل منیجر آفاق، پچھلے دو سال سے کمپنی میں غبن کر رہا تھا۔ اور یہ سب وہ اتنی صفائی سے کر رہا تھا کہ اُس پر شک بھی نہ جا سکے'' عمر اُسے بتا رہا تھا۔

''یہ اُسکی ٹرانزیکشن (لین دین) ہے جو وہ کمپنی کے اکاؤنٹس سے کرتا رہا ہے۔''اُس نے فائل کا مطلوبہ صفحہ کھول کے، اُسے علی کی طرف بڑھایا۔اُس نے اُسے لیکر مطالعہ شروع کیا۔

''تو تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا کرنا چاہیے ہمیں اسکے ساتھ؟''علی نے فائل بند کرتے ہوئے پوچھا۔

''لیگل ایڈوائزر نے تو کہا ہے کہ اُس سے ڈیمیجیز (جرمانہ) لیکر اُسے چھوڑ دینا چاہیئے۔حالانکہ اس پر جیل تو بنتی ہے۔''عمر نے بتایا۔

''صحیح کہہ رہا ہے وہ، فلحال ہم کسی دشمنی میں نہیں پڑ سکتے۔پہلے ہی جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہی کافی ہے۔باقی تم جیسا بہتر سمجھو''اُس نے اپنی رائے دی تھی۔

''میری بھی یہی رائے ہے، ہم اُس سے جرمانہ لیکر چھوڑ دیتے ہیں۔''عمر نے بھی تائید کی تھی۔دونوں ہی متفق ہو گئے تو، اُس نے علی سے فائل لیکر واپس بند کی تھی۔کافی دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی، پھر عمر اٹھنے ہی لگا تھا کہ علی نے اچانک ہی اُسے مخاطب کیا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟ کون یہ سب کر سکتا ہے؟''وہ واپس بیٹھا اور ناسمجھی سے اُسے دیکھنے لگا۔

''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''اُسی کی، جسکی وجہ سے ہم کل ایف آئی اے کے آفس میں موجود تھے''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں تو کل خود پوری رات جاگتا رہا ہوں۔سمجھ نہیں آرہا کہ کس کو ہم سے اتنی گہری دشمنی ہو سکتی ہے؟''گفتگو کا رخ نہ چاہتے ہوئے بھی کل کی طرف مڑ رہا تھا۔

''جو بھی ہے، معاملہ خطرناک ہے۔ہماری فیملیز بھی ہیں۔اگر ہماری جان خطرے میں ہے، تو اللہ نہ کریں اُنکی بھی۔۔۔''علی نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی تھی۔

''اللہ بہتر جانتا ہے کہ اب کیا ہوگا؟ خیر میں چلتا ہوں، دوپہر میں ہماری لیگل ایڈوائزر سے میٹنگ ہے''عمر بس اتنا ہی کہہ سکا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

علی اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کتنے عرصے؟ کتنے عرصے بعد اُن دونوں نے آپس میں کام کے علاوہ کوئی بات کی تھی؟ کتنے عرصے بعد اُن دونوں نے کسی شناسا کی طرح گفتگو کی تھی؟ تو کیا دس سال پہلے آئی دراڑ، بھرنا شروع ہو چکی تھی؟

ذہن کے پردے پر فلم کی طرح تمام مناظر چل رہے تھے۔ عمر اور اُسکا جھگڑا، وہ آخری رات جب وہ یہاں سے گیا تھا، وہ دن جب علی نے چھ سال بعد اُسے لفٹ میں دیکھا تھا اور وہ حیرت انگیز صبح، جب وہ آفس میں اُسکے نئے شراکت دار کے طور پر آیا تھا۔

کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا وہ اُسکے بارے میں۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔ کل رات سے اُسے کسی پل چین نہیں آیا تھا۔ نوید کا چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے آتا تھا۔ اپنے زہر میں بجھے وہ آخری الفاظ یاد آتے تھے جو اُس نے نوید سے کہے تھے۔ تھک کر اُس نے دوبارہ کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

وہ اُسے کیسے بتاتا؟ کہ پچھلے دس سالوں سے وہ اپنے کہے ایک ایک لفظ پر پچھتا رہا تھا۔

--------+-------+------

(جاری ہے)

نحل کی پانچویں قسط ماہِ اکتوبر کی پندرہ تاریخ کو میری ویب سائٹ اور فیس بک پیج پر پوسٹ کی جائے گی۔ انشاءاللہ